ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
بانی: اقتدار احمد مرحوم
۱۳ نومبر، ۲۰۰۲ء

اشاعت خصوصی بسلسۂ سال اقبال 2002ء

پیامِ اقبال بنام نوجوانانِ ملت

مدیر: حافظ عاکف سعید

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گُل سے کلام پیدا کر

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر!

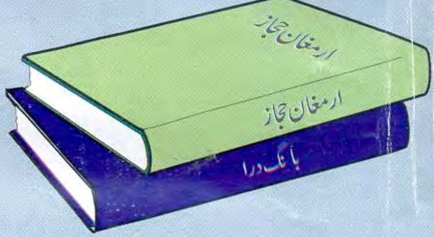

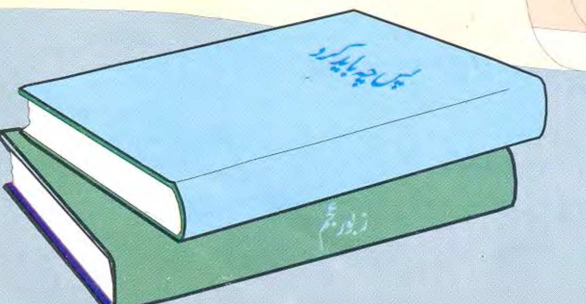

فہرستِ مضامین

حرفِ آغاز	.... تمہید و تعارف : پیامِ اقبال نمبر		2....
پیامبرِ اقبال	.... سوانحِ اقبال (از ولادت 9 نومبر 1877ء تا وفات 21 اپریل 1938ء)		3....
پیامِ منظوم	.... اقبال کے اردو اور فارسی مجموعہ ہائے کلام کا تعارف		13....
پیامِ اقبال کا ارتقاء	.... تینوں تخلیقی ادوار میں اقبال کا مخاطب صرف ''نوجوان'' ہے		17....
خودی	.... خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ	خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ	22 ....
فقر	.... اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور	قلندری میری کچھ کم سکندری سے نہیں	28 ....
عشق	.... جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے	مرا عشق میری نظر بخش دے	29 ....
عشقِ قرآن	.... قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان	اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار	31 ....
عشقِ رسولؐ	.... قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے	دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے	32 ....
مومن	.... یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن	قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن	38 ....
شاہین	.... تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا	ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں	40 ....
علم و عقل	.... یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت	پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات	41 ....
مغربی تعلیم	.... تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو	کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں	42 ....
مغربی تہذیب	.... دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش	تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو اُبھارا	43 ....
اسلام: نشاۃ ثانیہ	.... اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا	ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا	45 ....
دُخترانِ ملّت	.... وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ	اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں	54 ....
نونہالانِ ملّت	.... لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری	زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری	55 ....
پیام بذریعہ جاوید	.... دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر	نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر	57 ....
کلامِ منثور	.... علامہ اقبال کے بیانات، اعلانات اور خطوط سے شاہکار نثر پاروں کا انتخاب		71 ....

خصوصی مضامین

علامہ اقبال اور ہم	....	ڈاکٹر اسرار احمد	77 ....
اقبال اور دورِ ابلیسیت	....	حافظ عاکف سعید	79 ....
اور میں نے اقبال کو پالیا	....	قاضی عبدالقادر	81 ....
اقبال کی شعری اصطلاحات	....	فرقان دانش خان	83 ....
انگریزی مضمون	....	Iqbal in the Heart of Hearts	86 ....

...لافت کی ... دنیا میں ہو پھر استوار
...کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریک خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ لاہور

ندائے خلافت

جلد 11 شمارہ 44

7 تا 13 نومبر 2002ء

(یکم تا 7 رمضان المبارک ۱۴۲۳ھ)

○

بانی: اقتدار احمد مرحوم

مدیر: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: فرقان دانش خان

معاونین: مرزا ایوب بیگ، سردار اعوان
محمد یونس جنجوعہ

نگران طباعت: شیخ رحیم الدین

○

پبلشر: اسعد احمد مختار، طابع: رشید احمد چوہدری

مطبع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

مقام اشاعت: 36-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 03-5869501 فیکس: 5834000

E-Mail:anjuman@tanzeem.org

Website:www.tanzeem.org

○

خصوصی شمارہ کی قیمت : 50 روپے

سالانہ زرِ تعاون

اندرونِ ملک......250 روپے

بیرونِ پاکستان

☆ یورپ، ایشیا، افریقہ وغیرہ
...........1500 روپے

☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ
...........2200 روپے

حرفِ آغاز

اشاعتِ خصوصی: پیامِ اقبال بنام نوجوانانِ ملت

گزشتہ سال جب ''سالِ قائد اعظم'' کے حوالے سے سرکاری سرگرمیوں کا اختتام ہونے لگا تو حکومتِ پاکستان نے 2002ء کو علامہ اقبال کے 125 ویں سالِ ولادت کی نسبت سے ''سالِ اقبال'' قرار دینے کا اعلان کیا۔ یہ اعلان سنتے ہی ''مرکزی انجمن خدام القرآن'' کو بھی خیال آیا کہ اقبال پر ہونے والے کاموں میں ہمیں بھی شریک ہونا چاہئے' کیونکہ انجمن خدام القرآن کو اقبال کے ساتھ ایک نسبتِ خاص ہے۔ انجمن خدام القرآن یا تنظیم اسلامی کی جانب سے شائع کردہ کتب یا مضامین میں تو اقبال کے شعری حوالوں کے بغیر سلسلۂ کلام گویا ادھورا اور پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔ تنظیم و انجمن کے بانی مبانی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا بھی کوئی خطبہ اور کوئی مقالہ ایسا نہیں ہے جس کے متن کے جوہر میں روحِ اقبال شامل نہ کی گئی ہو۔ قرآن و حدیث کے بعد اقبال پر ہمارا اس قدر بھروسا کرنے کی وجہ خود محترم ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں دیکھئے۔ انہوں نے 3 مئی 1974ء کو ایچی سن کالج لاہور کے طلبہ سے جو معرکۃ الآراء خطاب فرمایا تھا' وہ ''علامہ اقبال اور ہم'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا اور اس کے اب تک پانچ ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ اس خطبے میں اقبال سے ہم سب کی وابستگی کی ترجمانی کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا:

''میرے نزدیک پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان' قطع نظر اس سے کہ وہ عوام میں سے ہو یا خواص میں سے ہو اور بالکل ان پڑھ اور جاہل ہو یا عالم و فاضل' علامہ مرحوم کے ساتھ سہ گانہ و سہ گونہ رشتوں میں منسلک ہے۔

ایک یہ کہ مملکتِ خداداد سرزمین پاکستان جس میں ہم ایک آزاد اور خودمختار قوم کی حیثیت سے اقامت گزیں ہیں' اس کا وجود و قیام علامہ اقبال ہی کے تخیل و تصور کا رہینِ منت ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ عالمی ملتِ اسلامی اور امتِ مرحومہ جس سے ہم سب منسلک ہیں' اس دور میں اس کی عظمت و سطوتِ پارینہ کا سب سے بڑا مرثیہ خواں بھی اقبال ہے اور اس کے احیا و نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا حدی خواں بھی اقبال ہی ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ دینِ حق جس کے ہم سب نام لیوا ہیں' اس دور میں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس کے اسرار و رموز کا سب سے بڑا رازداں بھی اقبال ہی ہے' اور اس کی روحِ باطنی اور جسدِ ظاہری دونوں کے تجدید و احیاء کے عظیم ترین نقیب کی حیثیت بھی اقبال ہی کو حاصل ہے۔

یہ سہ گانہ تعلق تو علامہ اقبال کے ساتھ ہر پاکستانی مسلمان کو حاصل ہے' مجھے ذاتی طور پر ایک چوتھی خصوصی نسبت روحِ اقبال سے یہ ہے کہ ادھر کچھ عرصے سے یہ حقیقت مجھ پر شدت کے ساتھ منکشف ہو چکی ہے کہ احیائے اسلام کی شرطِ لازم تجدیدِ ایمان ہے اور ایمان کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآنِ حکیم ہے۔ گویا ملتِ اسلامی کی نشاۃ ثانیہ اور تشکیلِ جدید کی کوشش ہو یا احیائے اسلام اور غلبۂ دینِ حق کی جدوجہد دونوں کا اصل منبع و مدار اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کا قرآن حکیم کے ساتھ صحیح تعلق دوبارہ استوار کیا جائے' اور اس حقیقی نسبت کی تجدید کی کوشش کی جائے جو ایک مسلمان اور قرآن کے مابین ہونی چاہئے اور میں سمجھتا ہوں کہ ملتِ اسلامی اور دینِ حق دونوں کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کے اس طرح قرآنِ حکیم کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس اسی قدر بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدت کے ساتھ علامہ اقبال کو تھا۔''

علامہ اقبال سے ہماری اس خاص نسبت کا فطری تقاضا تھا کہ ہم نے بھی ''سالِ اقبال'' میں حسبِ استطاعت اپنا حصہ ڈالنے کا عزم کیا۔ فیصلہ ہوا کہ ''فلسطین نمبر'' کی طرح ''ندائے خلافت'' کا ایک خصوصی شمارہ علامہ مرحوم کے حوالے سے کسی ایسے اچھوتے اور منفرد موضوع کے لئے وقف کر دیا جائے' چنانچہ بہت سوچ بچار اور مشورے کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ آج کا سب سے بڑا مسئلہ نوجوانانِ ملت کی تعلیم و تربیت کا ہے کہ کروڑوں نفوس کا یہ قافلۂ سخت جاں جائے تو کدھر جائے۔ یاد رہے کہ پاکستان میں سترہ سال تک کے بالغ نوجوانوں (نان ووٹروں) کی آبادی چار کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ چنانچہ ان کی رہنمائی و رہبری کے لئے علامہ اقبال کا تمام سرمایۂ شعر و نثر کھنگالنے کی مہم ملک کے ممتاز دانشور اور محقق جناب سید قاسم محمود کی سرکردگی میں شروع ہوئی۔ یوں مختلف لائبریریوں' کتب اور جرائد میں مواد کی تلاش کے کام میں کئی ماہ صرف ہوئے۔ اس ضمن میں موضوع سے متعلق مضامین کی مجموعی فہرست جناب محمد سہیل عمر (ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی) نے نہ صرف یہ کہ مرتب کرائی' بلکہ ان مضامین کی فوٹو کاپیاں بھی فراہم کیں۔ اس لطفِ خاص کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔

یوں تو علامہ اقبال کا پورا خطاب' مکالمہ اور کلام ہی نوجوانانِ ملت سے ہے' لیکن براہ راست مخاطبت کے لئے ان کے ایک ایک مصرعے اور ایک ایک سطر کے جواہر ریزے چن کر اس شمارے کے گلدستے میں جمع کر دیئے گئے ہیں جو ان شاء اللہ چمنستانِ اقبال میں ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے گا۔

اس شمارے کی ''فہرست مضامین'' ایک دریچہ ہے۔ اسے کھولئے تو اندر کے پورے محل کا منظر کھلتا چلا جائے گا۔ شمارے کے آخری حصے میں ''اقبالیات'' سے متعلق پانچ مضامین ایسے بھی شاملِ اشاعت ہیں جو بڑوں نے بڑوں کے لئے تحریر کئے ہیں' لیکن ہمارے نوجوان بھی ان کے مطالعہ سے اقبالیات کے دوسرے اہم گوشوں سے متعارف ہوں گے۔ جن اصحاب نے اس شمارے کی تدوین' ترتیب و تزئین میں ہمارا ہاتھ بٹایا ہے' اللہ انہیں جزائے خیر دے' اور اقبال کی دعائیں ان کے ساتھ ہمارے لئے بھی مستجاب ہوں۔

پیامبر اقبال: مختصر سوانح

یہ عجب حُسنِ اتفاق ہے کہ اُنیسویں صدی کا آٹھواں عشرہ بڑا ہی مردم خیز تھا۔ لینن (1870ء)' فلسفی برٹنڈرسل (1873ء)' چرچل اور ناول نگار سمرسٹ ماہم (1874ء)' امریکی ناول نویس تھامس مان (1875ء)' رضا شاہ اوّل (1876ء)' جرمنی کا چانسلر ایڈی نار (1877ء)' علامہ محمد اقبال (1877ء)' مولانا محمد علی جوہر اور کمال اتاترک اور قائداعظم (1876ء)' روسی سیاست دان ٹراٹسکی اور سٹالن اور سائنس دان آئن سٹائن (1879ء) سب اسی عشرے کی پیداوار ہیں۔ گویا قدرت دنیا کے مختلف گوشوں اور شعبوں میں جو انقلاب لانا چاہتی تھی' اُس کی داغ بیل اِسی عشرے میں ڈالی گئی۔

خاندانی پس منظر

علامہ اقبال کے اجداد ہندو برہمن تھے۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں کشمیر میں بے شمار صوفیائے کرام باہر سے تشریف لائے' جنہوں نے اپنے اعلیٰ کردار اور حسنِ سلوک سے مقامی ہندو آبادی کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور وہ جوق در جوق اسلام قبول کر کے ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے لگے تھے۔ 1650ء کے لگ بھگ سری نگر میں ایک سید درویش وارد ہوئے۔ علامہ اقبال کے جدِ امجد بھی اُن کی زیارت کے لئے سری نگر آئے۔ اس مردِ قلندر کی نگاہ کام کر گئی اور انہوں نے اِس درویش کے ہاتھ پر اسلام قبول کرلیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُن کا نام صالح رکھا گیا اور وہ بعد ازاں ''بابا صالح'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ سید درویش نے ان کے تقویٰ سے متاثر ہو کر اپنی دختر نیک اختر کا نکاح بھی ان سے کر دیا۔ علامہ اقبال نے اپنے خاندانی پس منظر کو یوں بیان کیا ہے:

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا میرے لاتی و مناتی

علامہ اقبال کے جد شیخ محمد رفیق کی پہلی شادی سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی۔ اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری شادی جلال پور جٹاں کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی۔ اس بیوی سے دس لڑکے پیدا ہوئے' لیکن سب ایک ایک کر کے داغِ مفارقت دے گئے۔ شیخ نور محمد (علامہ اقبال کے والد) گیارہویں اولاد تھے۔

شیخ نور محمد کو اپنے خاندان میں ''میاں جی'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ پہلے انہوں نے گزراوقات کے لئے' بچوں کے کرتے بنانے شروع کئے۔ پھر جب سیالکوٹ میں ایک ڈپٹی وزیر علی بلگرامی قیام پذیر ہوئے تو شیخ نور محمد نے ان کے ہاں کپڑے سینے کی ملازمت اختیار کرلی۔ بلگرامی نے شیخ صاحب کو ''سنگر'' مشین خرید کر دی جو اس زمانے میں ایک نادر چیز سمجھی جاتی تھی۔ بلگرامی کی ملازمت میں خاصی بچت ہو جاتی تھی' لیکن اقبال کی والدہ امام بی بی گھر میں ان کی تنخواہ کا ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرتی تھیں۔ ان کے خیال میں بلگرامی کی آمدنی حلال نہیں تھی۔ اپنی تنخواہ کی پذیرائی کا حال دیکھا تو شیخ نور محمد نے ملازمت چھوڑنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ ان کا نیا کاروبار ٹوپیاں سینے کا تھا۔ اس کاروبار نے اتنی ترقی کی کہ انہیں گاہکوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے کئی ملازم رکھنے پڑے۔ بعد میں جب ان کی عمر زیادہ ہوگئی تو انہوں نے یہ کام اپنے داماد غلام محمد کے حوالے کیا' جس کی لاپروائی سے کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔

علامہ اقبال کی والدہ امام بی بی خاندان میں ''بے جی'' کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھیں' لیکن صوم وصلوٰۃ کی بڑی پابند تھیں۔ حسنِ سلوک کے باعث سارا محلّہ ان کا گرویدہ تھا۔ ان کی دیانت داری کا یہ حال تھا کہ محلے کی اکثر عورتیں آپ کے پاس زیورات' نقدی اور دیگر قیمتی اشیاء بطور امانت رکھتی تھیں۔ محلے یا برادری میں خواتین میں آپس میں کبھی تُو تکار ہو جاتی تو ''بے جی'' کو ثالث مقرر کیا جاتا۔ وہ غریب عورتوں کی خفیہ امداد بھی کرتی رہتی تھیں۔ ایسا بھی ہوا کہ وہ غریب والدین کی بچیاں اپنے گھر لے آئیں اور انہیں بڑے ناز اور چاؤ سے پالا پوسا اور جب وہ جوان ہوگئیں تو ان کی شادی کرادی۔

شیخ نور محمد کو تصوف کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ پھر بچپن ہی سے اہلِ دین کی صحبتوں نے اس ذوق کو شوق کی حد تک بڑھا دیا تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ تصوف کے معاملات ومسائل سے بخوبی آگاہ تھے۔ اسی بناء پر انہیں ''ان پڑھ فلسفی'' کا خطاب دیا گیا

> ''آنحضرت ﷺ مجھ سے پوچھیں گے کہ ہم نے ایک بندۂ مسلم کو تیری فرزندی اور نگہداشت میں دیا' تُو اسے بھی آدمی نہ بنا سکا تو میں کیا جواب دوں گا۔ اے نورِ نظر! تُو اُمت محمدیؐ کا ایک فرد ہے۔ تجھے اخلاق محمدیؐ سے بہرہ ور ہونا چاہئے اور سراپا شفقت و رحمت بننا چاہئے نہ کہ ظلم و فرعونیت کا نمونہ۔''

تھا۔ ان کی عادات واطوار اور مشاغل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوّل و آخر صوفی تھے اور خوفِ خدا انہیں ہر وقت دامن گیر رہتا تھا۔ ''رموزِ بے خودی'' میں اقبال نے اپنے والد محترم کی خداترسی کا حال منظوم انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک بار کسی فقیر نے بھیک مانگنے کے لئے ان کے دروازے پر صدا لگائی اور کچھ لئے بغیر وہاں سے کسی طرح نہ ٹلا۔ نوجوان اقبال کو اس بات پر سخت غصہ آیا اور انہوں نے اسے دو چار طمانچے رسید کر دیئے۔ اس سے فقیر کی جھولی میں جو کچھ تھا' وہ سب زمین پر گر پڑا۔ ان کے والد نے یہ منظر دیکھا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے گلوگیر لہجے میں اپنے بیٹے اقبال سے کہا:

> ''قیامت کے دن جب رسولِ کریم ﷺ کے اردگرد ساری اُمت مسلمہ جمع ہوگی' غازی' شہید' عالم' حافظ' عابد سب موجود ہوں گے اور یہ مظلوم فقیر آقائے نامدارؐ کے سامنے تمہارے اِس ظلم کی فریاد کرے گا' اور آنحضرت ﷺ مجھ سے پوچھیں گے کہ ہم نے ایک بندۂ مسلم کو تیری فرزندی اور نگہداشت میں دیا' تو اسے بھی آدمی نہ بنا سکا تو میں کیا جواب دوں گا۔ اے نورِ نظر! تو امت محمدیؐ کا ایک فرد ہے۔ تجھے اخلاق محمدیؐ سے بہرہ ور ہونا چاہئے اور سراپا شفقت و رحمت بننا چاہئے نہ کہ ظلم و فرعونیت کا نمونہ۔''

اقبال کے دل پر اپنے والد محترم کی یہ نصیحت اثر کر گئی بلکہ اُن کے دل و دماغ پر ایک دائمی نقش چھوڑ گئی۔

شیخ نور محمد کے ہاں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے لڑکے کا نام شیخ عطا محمد اور چھوٹے لڑکے کا نام محمد اقبال تھا۔ شیخ عطا محمد نے ابھی میٹرک بھی پاس نہیں کیا تھا کہ ان کی شادی برٹش انڈین آرمی کے ایک ریٹائرڈ پنشنر سپاہی کی لڑکی سے ہو گئی۔ خسر کے اثر و رسوخ کی وجہ سے شیخ عطا محمد کو پہلے فوج میں "رسالہ" میں ملازمت مل گئی۔ پھر بعد میں انہیں رُڑکی کے انجینئرنگ سکول میں داخلہ مل گیا۔ کورس کی تکمیل کے بعد وہ فوج میں اوورسیئر بن گئے اور ترقی کرتے کرتے ایس ڈی او بن گئے۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران مختلف مقامات پر متعین رہے اور کچھ عرصہ ایم ای ایس ایبٹ آباد میں بھی گزارا۔ اس ملازمت میں انہوں نے کافی روپیہ بچایا۔ اقبال کی اعلیٰ تعلیم کا خرچہ بھی انہوں نے ہی برداشت کیا۔ بعد ازاں اُن کا میلان قادیانیت کی طرف ہو گیا۔ شیخ عطا محمد کے دو فرزند تھے: شیخ اعجاز احمد اور مختار احمد۔ شیخ عطا محمد کا انتقال 1940ء میں ہوا۔

اقبال کے والد محترم شیخ نور محمد کا انتقال 17 / اگست 1930ء کو ہوا۔ والدہ محترمہ امام بی بی 9 نومبر 1914ء کو 78 سال کی عمر میں رحلت فرما گئیں۔ وہ اقبال سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اقبال بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ گرمیوں میں عدالتیں بند ہوتیں تو وہ انہیں ملنے کے لئے سیالکوٹ تشریف لے جاتے۔ وہ بھی اُن کے خط کا بڑی بے تابی سے انتظار کیا کرتیں۔ جب اقبال اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یورپ تشریف لے گئے تو وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ان کی بخیریت وطن واپسی کے لئے دعا مانگا کرتیں۔ اقبال نے اپنی شخصیت پر والدہ کے اثرات کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے اس کا اندازہ اُن کے اس مرثیے سے ہوتا ہے جو انہوں نے والدہ کی وفات پر لکھا اور بعد میں "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کے عنوان سے "بانگِ درا" کے اوراق میں شامل ہوا۔

کس کو اب ہو گا وطن میں آہ میرا انتظار
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار
خاکِ مرقد پر تیری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو یاد آؤں گا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر میرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی
آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مولانا عبدالمجید سالک جب تعزیت کے لئے علامہ اقبال کے پاس گئے تو وہ دیر تک اپنی والدہ کی خوبیاں بیان کرتے رہے اور ساتھ ساتھ روتے بھی جاتے تھے۔ فرمانے لگے: "جب میں سیالکوٹ جاتا اور والدہ شگفتہ دلی سے فرماتیں "میرا بالی آ گیا" تو میں ان کے سامنے خود کو ایک ننھا منا بچہ محسوس کرنے لگتا۔"

پیدائش اور بچپن

اقبال 9 نومبر 1877ء بمطابق 3 ذی قعدہ 1294ھ کو سیالکوٹ کے محلہ چودھری دھاب میں (جسے آج کل اقبال سٹریٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے) پیدا ہوئے۔ نومولود کا نام اُس کی والدہ نے "محمد اقبال" رکھا۔ اقبال ابھی دو سال کے تھے کہ کسی بیماری میں جونکیں لگانے کی "دوا" تجویز کی گئی۔ کنپٹی پر جونکیں لگانے سے داہنی آنکھ سے کافی مقدار میں خون خارج ہو گیا جس کی وجہ سے داہنی آنکھ کی بصارت ہمیشہ کے لئے جاتی رہی۔ لیکن بائیں آنکھ کی بینائی اس قدر تیز تھی کہ انہیں آخری عمر تک کبھی دائیں آنکھ کی بصارت چلے جانے کا احساس نہ ہوا۔ آخری بیماری میں جب صحت مند بائیں آنکھ میں موتیا اتر آیا تو انہیں اُس وقت محسوس ہوا کہ اُن کی ایک آنکھ پہلے ہی سے ناکارہ ہے۔

ابتدائی تعلیم قدیم اور روایتی طرز کے مکتب میں حاصل کی۔ پہلے انہیں مولانا غلام حسن کے مکتب میں بٹھایا گیا۔ بعد ازاں مولوی میر حسن کے مکتب میں درس لینے کے بعد انہی کے مشورے پر انہیں سیالکوٹ کے سکاچ مشن سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یہاں سے پانچویں جماعت کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کرنے پر وظیفہ ملا۔ 1891ء میں مڈل اور 1893ء میں میٹرک پاس کیا۔ آپ کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ سکول میں دیر سے آنے پر ماسٹر صاحب نے بازپرس کی تو آپ نے بے ساختہ جواب دیا: "اقبال دیر ہی میں آتا ہے۔"

ایک دفعہ اقبال اپنے استاد محترم مولوی میر حسن کے گھر کے لئے بازار سے سودا سلف خرید کر واپس آئے تو راستے میں میر حسن صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے اقبال کو دیکھتے ہی کہا "تمہیں کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ بازار سے ہمارے لئے سودا سلف نہ لایا کرو۔ تم میرے شاگرد ہو نوکر نہیں۔"

اس پر اقبال نے مسکرا کر جواب دیا: "جناب میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں۔"

اقبال نے سکاچ مشن کالج (مرے کالج) سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔ یہیں سے ایف اے کیا۔ انہوں نے جس ماحول میں تعلیمی مراحل طے کئے اس کی ایک جھلک اقبال کے

"بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھ کر پڑھو کہ یہ قرآن تم پر ہی اترا ہے یعنی جیسے اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔"

اپنے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

"جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا۔ والد صاحب اپنے درود و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک صبح وہ میرے پاس سے گزرے تو فرمایا: "کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔" بالآخر انہوں نے ایک مدت کے بعد یہ بات بتائی۔ ایک دن صبح جب میں حسب دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا: "بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھ کر پڑھو کہ یہ قرآن تم پر ہی اترا ہے یعنی جیسے اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔"

لاہور میں آمد

اُن دنوں سکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں بی اے کی کلاسوں کا اجرا نہیں ہوا تھا (اس وقت تک وہ مرے کالج کے نام سے منسوب نہیں ہوا تھا)۔ چنانچہ اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔ 1897ء میں بی اے کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور عربی میں اوّل آنے پر وظیفے کے علاوہ سونے کے دو تمغے بھی حاصل کئے۔ اسی سال انہوں نے ایم اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا جہاں انہیں سر ٹامس آرنلڈ کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ آرنلڈ لاہور آنے سے پہلے علی گڑھ میں دس سال تک فلسفہ پڑھا چکے تھے اور اس دوران میں انہوں نے مولانا شبلی سے عربی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ جب آرنلڈ ہندوستان چھوڑ کر لندن روانہ ہوئے تو اقبال نے ایک نظم "نالۂ فراق" بطور یادگار لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں! — آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں
کشتۂ عزلت ہوں آبادی میں گھبراتا ہوں میں — شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں
ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا — آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا

نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا — آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم — تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم
کھول دے گا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو — توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو — کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو!

''تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا''

1899ء میں یعنی سرسید کے انتقال سے ایک برس بعد اقبال نے ایم اے پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آنے پر نواب علی بخش گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اب وہ اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے ریڈر مقرر ہوئے۔ تنخواہ **73** روپے ماہوار تھی۔ آپ بھاٹی گیٹ کے قریب رہتے تھے۔ انہی ایام میں علی بخش جیسا جاں نثار ملازم ملا جس نے خدمت کا حق ادا کر دیا۔ بعدازاں آپ کو گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کی اسسٹنٹ پروفیسری مل گئی اور اس کے ساتھ ساتھ آپ انگریزی بھی پڑھانے لگے۔ یہ ملازمت **2** ستمبر **1905**ء تک رہی۔ اس کے بعد آپ نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے کالج سے چھٹی لے لی اور یوں پڑھانے کا یہ سلسلہ عارضی طور پر منقطع ہو گیا۔

شاعری کا آغاز

اقبال نے سیالکوٹ کے سکاچ مشن کالج کی طالب علمی کے زمانے میں شعر کہنا شروع کر دیئے تھے۔ پہلے پنجابی میں شعر کہتے رہے۔ پھر مولوی میر حسن کے مشورے پر اردو میں کہنے لگے۔ سیالکوٹ میں ہونے والے اردو مشاعروں میں بھی حصہ لیتے رہے۔

شاعری کی طرف اقبال کے رجحان کے پس منظر میں میر حسن کی ذات نظر آتی ہے جو خود بھی اردو اور فارسی شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ مولانا میر حسن نے اقبال کو گلستان' بوستان' سکندر نامہ' انوار سہیلی اور سہ نثر ظہوری کا درس دیا تھا' چنانچہ لڑکپن میں اقبال کے ذہن سے کلام موزوں نکلے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

جب اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا تو ان کا یہ شوق پہلے سے کہیں زیادہ ترقی کر گیا۔ اب وہ بذریعہ خط و کتابت داغ کے شاگرد بن گئے اور انہیں اپنی غزلیں بغرضِ اصلاح بھیجنے لگے۔ اُن دنوں داغ دہلوی حیدرآباد دکن کے دربار سے منسلک تھے۔ چند غزلوں میں معمولی سی اصلاح کے بعد داغ نے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ ان کا کلام اصلاح سے بے نیاز ہے۔

داغ دہلوی کے علاوہ اقبال نے لاہور کے ایک ممتاز شاعر ارشد گورگانی سے بھی اصلاح لی۔ علاوہ ازیں اقبال لاہور کے مشاعروں میں باقاعدگی سے حصہ لیتے رہے۔ یہ مشاعرے بازار حکیماں (اندرون بھاٹی گیٹ) میں ''انجمن مشاعرہ اتحاد'' کے زیرِ اہتمام منعقد ہوتے تھے۔ ان کے اس شعر نے پہلی مرتبہ مشاعرے کے سامعین کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

ایک اور مشاعرے میں اقبال کا کلام سن کر مولانا شبلی نعمانی نے کہا: ''جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے۔''

اقبال کے پیام کو عوام تک پہنچانے میں ''انجمن حمایت اسلام'' کا بھی بڑا حصہ ہے۔ انجمن ہی کے پلیٹ فارم سے اقبال نے اپنی پہلی نظم ''نالۂ یتیم'' سنائی تھی جس سے حاضرین ششدر رہ گئے تھے۔

یورپ کا سفر

یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خیال علامہ اقبال کے ذہن میں کس طرح آیا؟ اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔ دراصل کئی عوامل مل کر فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ ایک واقعہ تو ان کا ''ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر'' کے لئے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا تھا۔ یہ امتحان **1901**ء میں ہوا تھا۔ امید تھی کہ اقبال اس میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہو جائیں گے' لیکن میڈیکل بورڈ نے دائیں آنکھ کے نقص کی بنیاد پر ''غیر موزوں'' قرار دے دیا۔ اس کھلی دھاندلی پر خوب شور مچا۔ منشی محمد دین فوق اور منشی محبوب عالم (مدیر ''پیسہ اخبار'') نے بہت احتجاج کیا' لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ شاید اسی واقعے سے دل برداشتہ ہو کر اقبال نے یورپ جانے کا فیصلہ کیا۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کو قانون کی تعلیم حاصل کرنے سے خاصی دلچسپی تھی۔ لاہور کے ''لاء سکول'' سے آپ نے وکالت کا امتحان پاس کرنے کی کوشش کی تھی' لیکن قانونی پیچیدگیاں حائل ہو گئیں۔ جب آپ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد پر حکومت کے بعض افسروں نے جھوٹا مقدمہ چلایا' تو آپ کا یہ احساس اور بھی شدت اختیار کر گیا ہو گا کہ انہیں قانون کی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہئے۔

یورپ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اپنے محبوب استاد سر ٹامس آرنلڈ کے لندن واپس چلے جانے سے اور بھی زیادہ شدید ہو گئی تھی۔ غالباً انہوں نے بھی اپنے لائق شاگرد کو انگلستان آنے کی دعوت دی ہو گی۔ اس وقت تک آپ نے اپنی ملازمت سے کچھ رقم پس انداز کر لی تھی' لیکن بیشتر اخراجات آپ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے برداشت کئے۔ اقبال نے ملازمت سے ''بغیر تنخواہ'' طویل چھٹی لی۔ اس وقت شیخ عطا محمد ایم ای ایس ایبٹ آباد میں ملازم تھے۔ چنانچہ جب یورپ جانے کے لئے تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو اقبال اپنے بھائی سے ملنے ایبٹ آباد گئے۔ ایبٹ آباد میں شام کے وقت آپ باغ کی سیر کو نکلے' اور جہاں اب میونسپل کمیٹی کا دفتر ہے' اس کے سامنے کھڑے ہو کر کوہ سربن سے اٹھنے والی گھٹا اور پل بھر میں بارش برسنے کا دلفریب منظر دیکھا اور اس سے متاثر ہو کر نظم ''ابر'' لکھی جو ''بانگ درا'' میں شامل ہے۔

اٹھی پھر آج وہ پُورب سے کالی کالی گھٹا — سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا
گرج کا شور نہیں ہے' خموش ہے یہ گھٹا — عجیب میکدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا
جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے' اٹھے — زمیں کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے' اٹھے
ہوا کے زور سے ابھرا' بڑھا' اڑا بادل — اٹھی وہ اور گھٹا' لو! برس پڑا بادل

ایک دو دن ایبٹ آباد میں قیام کے بعد واپس لاہور آ گئے۔ پھر دہلی گئے۔ وہاں خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر گئے اور ''التجائے مسافر'' کے عنوان سے اپنا الوداعی سلام پیش کیا۔ امیر خسرو اور غالب کے مزار پر بھی حاضری دی۔ ''التجائے مسافر'' کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو' زیرِ آسماں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر — تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو
پھر آ رکھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں — کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھ کو
وہ میرا یوسفِ ثانی' وہ شمعِ محفلِ عشق — ہوئی ہے جس کی اخوت' قرارِ جاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی' دل کی پھول جائے — یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اِس دعا میں اقبال کے آئندہ ذہنی سفر کی منزلوں کے نشان صاف طور پر دکھائی دے رہے ہیں۔ ''یوسف ثانی'' اپنے بھائی شیخ عطا محمد کی طرف اشارہ ہے' جنہوں نے چھوٹے بھائی کا مستقبل بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

اقبال۔۔۔یورپ میں

انگلستان پہنچنے کے بعد اقبال نے اپنے استاد آرنلڈ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان کا قیام کسی ایسے گھر میں کر دیا جائے' جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو۔ یورپ میں یہودیوں کے ہاں ہی اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک یہودی عورت کے ہاں' جس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی' قیام کیا۔ اس عورت کے ہاں قیام کے دوران ان کی یہ عادت تھی کہ وہ رفعِ حاجت کے لئے لوٹا ساتھ لے جاتے تھے۔ مالکہ مکان نے ایک دن پوچھا کہ تم غسل خانے میں لوٹا کیوں ساتھ لے جاتے ہو۔ آپ نے فرمایا: ''اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں' بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے۔'' اس سلسلے میں مزید گفتگو کے دوران انہوں نے طہارت کے اسلامی اصول بیان کئے۔ مثلاً انہوں نے بتایا کہ غسلِ جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اس طرح فرض ہے کہ جس طرح عورت پر طہر کا غسل۔ پھر آپ نے اس عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''بڑی بی' آپ کو اس طرح کے کسی غسل کی حاجت نہ ہوگی' البتہ طہارت کے لئے پانی ضرور استعمال کیجئے۔'' یہ باتیں سن کر بڑی بی بہت خوش ہوئیں اور اسلامی قاعدے سے طہارت کرنے کا وعدہ کرلیا۔

1905ء میں اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسی کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد لندن کے لاء کالج ''لنکن اِن'' میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اسی دوران میں آپ نے میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے لئے ''فلسفۂ عجم'' پر مقالہ لکھنے کا آغاز کر دیا۔ آپ نے اپنا مقالہ انگریزی میں لکھا۔ **28**/اگست **1907**ء کو میونخ پہنچے۔ وہاں پروفیسر ران کی حسین اور طرح دار بیٹی ان کی معلم اور اتالیق رہی۔ **30**/اگست کو آپ ہائیڈل برگ میں مقیم ہوگئے (چنانچہ اب وہاں ایک تختی نصب کی گئی ہے جس میں اقبال کا نام اور ان کے قیام کی تاریخیں درج ہیں)۔ **4** نومبر **1907**ء کو میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد لندن واپس آئے اور ''لنکن اِن'' سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اس کے علاوہ معاشیات اور سیاسیات کے مطالعے کے لئے ''لندن سکول آف اکنامکس'' میں داخلہ لیا' اور کیمبرج یونیورسٹی سے ''فلسفۂ اخلاق'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈگری بھی حاصل کی۔

قیامِ یورپ کا زمانہ اقبال کی ذہنی نشوونما میں ایک نہایت اہم دور قرار دیا جاسکتا ہے' کیونکہ اس دور میں اقبال کے تخیلات میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں اور انہوں نے اپنے لئے ایک منزل کا تعین کیا۔ اس ضمن میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ انگلستان کی مادی خوشحالی سے پیدا ہونے والی لادینیت اور بے راہ روی نے اقبال پر الٹا اثر کیا اور یوں اسلامی تعلیمات و معاملات اور شعائر میں ان کا شغف پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ قیامِ یورپ کے زمانے کی جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں' اس کے لئے ہم اقبال کی ایک خاتون دانشور دوست بیگم عطیہ فیضی کے مرہونِ منت ہیں' جن کے ساتھ علامہ کی انگلستان اور جرمنی میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ اقبال کی دعوت پر وہ کچھ عرصہ جرمنی میں بھی رہیں اور پھر واپس ہندوستان لوٹ آئیں۔

مئی **1908**ء میں لندن کے کیکسٹن ہال میں جسٹس سید امیر علی کے زیرِ صدارت مسلمانانِ لندن کا اجلاس ہوا' جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی لندن شاخ کا افتتاح ہوا۔ سید امیر علی صدر اور اقبال مجلسِ عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔ اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی میں اسلام اور اسلامی فلسفے پر نصف درجن مقالات لکھے۔ ''پان اسلامک سوسائٹی'' کی تنظیم میں حصہ لیا۔ انگلستان' سکاٹ لینڈ اور جرمنی کے مختلف علاقوں کے دورے کئے۔ لندن میں اسلام پر کئی لیکچر دیئے۔ پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھنے کے دوران عجمی تصوف کا تحقیقی مطالعہ کیا' جس سے نظریۂ وحدت الوجود کا طلسم پاش پاش ہوگیا۔ وطنیت کا جو تصور یورپی اقوام میں رائج تھا' اقبال نے اس کا بھی بغور مشاہدہ کیا اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وطنیت خود ایک بت ہے اور اسے توڑنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

قیامِ یورپ کے دوران میں عملی جدوجہد کی برکتیں کچھ اس طرح روشن ہوئیں کہ اقبال نے شاعری چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا' لیکن شیخ عبدالقادر اور سر آرنلڈ کے اصرار پر یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں جو دوسری اہم تبدیلی واقع ہوئی' وہ فارسی کو اپنے اظہار کے لئے برتنا تھا۔ اب اقبال نے زیادہ تر فارسی ہی کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ قیامِ یورپ کے آخری ایام میں پروفیسر آرنلڈ کی رخصت کے دوران چھ ماہ تک لندن میں عربی کے پروفیسر رہے اور تین برس کے قیام کے بعد متعدد ڈگریوں کے ساتھ واپس وطن لوٹے۔

''پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھنے کے دوران عجمی تصوف کا تحقیقی مطالعہ کیا' جس سے نظریۂ وحدت الوجود کا طلسم پاش پاش ہو گیا۔ وطنیت کا جو تصور یورپی اقوام میں رائج تھا' اقبال نے اس کا بھی بغور مشاہدہ کیا اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وطنیت خود ایک بُت ہے اور اسے توڑنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔''

یورپ سے واپسی

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال پہلے بمبئی میں اپنے دوستوں سے ملے۔ اس کے بعد انہوں نے دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاء' امیر خسرو اور غالب کے مزار پر دوبارہ حاضری دی اور انبالہ میں احباب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد **27** جولائی **1908**ء بروز دوشنبہ دوپہر کی ریل گاڑی سے لاہور پہنچے۔ دوست اور عقیدت مند اپنی معیت میں بھاٹی دروازے لے گئے' جہاں باغ میں شامیانے نصب کر کے چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تقریب سے فارغ ہوکر آپ اسی دن سیالکوٹ اپنے والدین سے ملنے چلے گئے۔

تین چار روز کے بعد اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد لاہور آئے اور مرزا جلال الدین بیرسٹر کے ذمہ ایک دفتر کرائے پر لینے کا کام سونپ گئے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے موہن لال روڈ (اردو بازار) پر منشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام کے سامنے ایک مکان کرائے پر لیا۔ بڑے بھائی اور بعض احباب کا اصرار یہ تھا کہ اقبال ضلع کچہری میں وکالت کریں' لیکن خود اقبال نے چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ دو تین ماہ کے بعد انہوں نے یہ مکان چھوڑ کر انارکلی بازار کا وہ بالا خانہ کرائے پر حاصل کرلیا' جس میں اس سے پہلے سر محمد شفیع بھی کافی عرصے تک قیام کر چکے تھے۔ اس مکان میں دفتر بھی تھا اور سکونت بھی۔

وکالت کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج میں ڈیڑھ سال تک ایم اے کو فلسفہ اور بی اے کو انگریزی پڑھاتے رہے۔ وکالت کے زمانے میں علامہ اقبال کے منشی ''منشی طاہر الدین'' تھے (یہ وہی صاحب ہیں جن کی ایجاد کردہ دوا ''دل روز'' کافی مقبول ہوئی)۔ بحیثیت وکیل اقبال نے **1908**ء سے **1934**ء تک کام کیا۔ ان کی دوسری دلچسپیاں بھی ایسی تھیں کہ وہ اپنی پوری توجہ قانون کے پیشے کو نہ دے سکے' چنانچہ اس میں کوئی خاص شہرت ان کے حصے میں نہ آئی۔

1917ء میں سر اکبر حیدری نے قانون کی پروفیسری کے لئے حیدر آباد آنے کی دعوت دی اور لکھا کہ آپ کو پرائیویٹ پریکٹس کی اجازت ہوگی' لیکن آپ نے یہ ملازمت قبول نہ کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے بھی آپ کو پروفیسری کی پیشکش کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی تاریخ کی پروفیسری کی پیشکش ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں بحیثیت پرنسپل تقرری کی تجویز پیش ہوئی۔ لیکن آپ نے یہ تمام ملازمتیں قبول نہیں کیں۔ وجہ یہ تھی کہ اقبال

اظہار رائے کی آزادی کو کسی بھی قیمت پر قربان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ زندگی کو اپنے نصب العین کی روشنی میں ایک خاص ڈھب سے گزارنے کے لئے انہوں نے چند اصول بنائے ہوئے تھے' جن پر عمل کرنے کو وہ ہر چیز پر مقدم سمجھتے تھے۔

دوسری گول میز کانفرنس

حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے آئینی مسائل کے حل کے لئے دوسری گول میز کانفرنس کا اعلان کیا جو ستمبر **1931**ء میں لندن میں منعقد ہونے والی تھی۔ اس میں شرکت کے لئے مولانا شوکت علی' مولانا شفیع داؤدی' سر آغا خان' محمد علی جناح اور علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا گیا۔ انہی ایام میں علامہ اقبال کو مزید دو دعوتیں موصول ہوئیں۔ پہلی دعوت روم اکیڈمی کی طرف سے تھی۔ مفتیٔ اعظم فلسطین سید امین الحسینی نے عالمِ اسلام کے اتحاد کا ایک جامع منصوبہ بنایا اور تمام اسلامی ممالک کے نمائندوں کو بیت المقدس آ کر تبادلۂ خیال کی دعوت دی۔ علامہ اقبال کو بھی شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔

علامہ اقبال **8**/اگست **1931**ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن دہلی کے ریلوے سٹیشن پر پہنچے جہاں کوئی تین ہزار افراد آپ کے انتظار میں جمع تھے۔ جونہی گاڑی رکی اور آپ اپنے ڈبے سے باہر نکلے' ہجوم نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور پھولوں کی بارش شروع کر دی۔ آپ نے مختصر سا خطاب کرتے ہوئے کہا:

''میرے ساتھ نہ تو کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے اور نہ سیاسی لٹریچر کا پلندہ جس پر اپنے دلائل کی اساس قائم کروں۔ میرے ساتھ حق وصداقت کی ایک جامع کتاب ''قرآن مجید'' ہے' جس کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔''

20/اگست کو پورٹ سعید پہنچے۔ عدن کی بندرگاہ پر ساحلِ عرب کو دیکھ کر آپ پر عجیب وغریب جذباتی کیفیت طاری ہو گئی اور سرزمین عرب کو مخاطب کرتے ہوئے وہ یوں گویا ہوئے:

''میرے ساتھ نہ تو کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے اور نہ سیاسی لٹریچر کا پلندہ جس پر اپنے دلائل کی اساس قائم کروں۔ میرے ساتھ حق وصداقت کی ایک جامع کتاب قرآن مجید ہے' جس کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔''

''اے عرب کی مقدس سرزمین' تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پتھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا' مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا جادو کیا کہ موجودہ دنیا کے تہذیب وتمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی...... تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اس پاک سرزمین میں جا سکوں' جس کی گلیوں میں اذانِ بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔''

27/اگست **1931**ء کو اقبال انگلستان پہنچے اور اپنے سات سالہ فرزند جاوید اقبال کو بذریعہ تار خیریت سے لندن پہنچنے کی اطلاع بھیجی۔ اس اثنا میں مولانا غلام رسول مہر یورپ ہوتے ہوئے انگلستان پہنچ گئے۔ **18** نومبر کو لندن کی ''اقبال لٹریری ایسوسی ایشن'' نے علامہ اقبال کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا' جس میں ہندوستان اور انگلستان کی منتخب علمی وسیاسی شخصیتوں نے شرکت کی۔ لفظ ''پاکستان'' کے خالق چوہدری رحمت علی بھی شریک محفل تھے۔ اقبال کی تصنیف ''اسرار خودی'' کے انگریز مترجم اور علامہ اقبال کو یورپ کے ادبی حلقوں میں متعارف کرانے والے پروفیسر نکلسن بھی موجود تھے۔ سروجنی نائیڈو بھی حاضر تھیں۔ صدارت کے فرائض سر شیخ عبدالقادر نے انجام دیئے۔

گول میز کانفرنس کے دوران لندن میں اقبال کو اپنے فرزند جاوید اقبال کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط موصول ہوا' جس میں انہوں نے اپنے والد سے گراموفون لانے کی فرمائش کی تھی۔ گراموفون تو خیر وہ نہ لائے' البتہ خط کے جواب میں ایک غزل لکھ کر بھیج دی جو ''بانگِ درا'' میں ''جاوید کے نام'' کے عنوان سے شامل ہے۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر میرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں' فقیری ہے خودی نہ بیچ' غریبی میں نام پیدا کر

انگلستان سے واپسی میں اٹلی کی حکومت کی دعوت پر روم گئے۔ مولانا غلام رسول مہرؔ علامہ صاحب کی معیت میں تھے۔ معلوم ہوا کہ افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان غازی بھی روم میں مقیم ہیں۔ چنانچہ کوئی تین گھنٹے تک ملاقات ہوئی' جس میں انگلستان اور عالمِ اسلام کا مستقبل خاص طور پر زیر بحث رہا۔

27 نومبر کو مسولینی کی خواہش پر علامہ اقبال نے اس سے ملاقات کی۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد مسولینی نے علامہ سے پوچھا: ''میری فاشسٹ تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

علامہ اقبال نے جواب دیا: ''آپ نے ڈسپلن کے اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام اپنے نظامِ حیات کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہے' لیکن اگر آپ اسلام کا نظریۂ حیات پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہو سکتا ہے۔''

مسولینی نے علامہ سے اٹلی کے قیام کے بارے میں ان کے تاثرات پوچھے۔ آپ نے فرمایا: ''میں اطالویوں کے متعلق سمجھتا ہوں کہ وہ ایرانیوں سے کافی مشابہت رکھتے ہیں' اور بڑے ذہین وفطین' خوبصورت اور فن پرست ہیں۔ ان کے پیچھے تمدن کی کتنی ہی صدیاں ہیں' مگر ان میں خون نہیں۔''

مسولینی نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تو آپ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ''ایرانیوں کو ایک فائدہ میسر رہا ہے جو اطالویوں کو میسر نہیں' اور وہ یہ کہ ان کے اردگرد مضبوط اور توانا قومیں افغان' کرد اور ترک آباد ہیں جن سے وہ تازہ خون حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ اطالوی ایسا نہیں کر سکتے۔''

اس پر مسولینی نے پوچھا: ''اچھا ہم اہلِ اٹلی کو کیا کرنا چاہئے؟''

علامہ اقبال نے جواب دیا: ''یورپ کی تقلید سے منہ موڑ کر مشرق کا رخ کرو اس لئے کہ یورپ کا اخلاق ٹھیک نہیں۔ مشرق کی ہوا تازہ ہے' اس میں سانس لو۔''

مسولینی نے علامہ اقبال سے کوئی اچھوتا مشورہ طلب کیا جو خاص اٹلی کے حالات کے لئے موزوں ہو۔ انہوں نے فرمایا: ''ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اسے ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہ دو۔ اس سے زیادہ آبادی کے لئے نئی بستیاں مہیا کی جائیں۔''

مسولینی نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا: ''شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی جاتی ہے' اس کی تہذیبی واقتصادی توانائی بھی کم ہوتی جاتی ہے اور ثقافتی توانائی کی جگہ محرکاتِ شر لے لیتے ہیں۔'' علامہ اقبال نے مزید کہا:

''یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ میرے رسولؐ نے تیرہ سو سال پہلے یہ مصلحت آمیز

ہدایت جاری فرمائی تھی کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کی بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔"

یہ حدیثِ قدسی سنتے ہی سولینی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ میز پر زور سے مارتے ہوئے کہنے لگا: "کتنا خوبصورت خیال ہے!"

علامہ اقبال نے "سولینی" کے عنوان سے ایک نظم بھی لکھی تھی، جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت! یہ تمنا! یہ نمود!
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب!

اس ملاقات کے کچھ عرصہ بعد جب سولینی نے حبشہ پر چڑھائی کر دی تو آپ نے سولینی کی جوع الارض کی حرص کی سخت مذمت کی۔ 18 اگست 1935ء کو ایک نظم "ابی سینیا" کے عنوان سے لکھی جو ضرب کلیم میں شامل ہے۔

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش
اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ
روما نے کر دیا سرِ بازار پاش پاش
پیرِ کلیسا! یہ حقیقت ہے دل خراش

ایک دفعہ کسی نے علامہ اقبال کو لکھا کہ آپ نے سولینی کے متعلق دو نظمیں لکھی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس کی کیا وجہ ہے! اس پر آپ نے مختصر سا جواب دیا: "اگر اس بندۂ خدا میں رحمانی اور شیطانی دونوں صفات موجود ہیں تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے؟"

اٹلی میں دورانِ قیام ایک روز علامہ اقبال مولانا غلام رسول مہر کی معیت میں کولوسیم کے آثار قدیمہ دیکھنے گئے۔ ایک ماہر نے بتایا کہ روم کے ان اکھاڑوں میں پچاس ہزار آدمی بیک وقت تماشا دیکھ سکتے تھے۔ واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد مہر صاحب سے کہنے لگے:

"ایک طرف قدیم رومی شہنشاہ تھے جنہوں نے ایک عظیم الشان عمارت اس غرض کے لئے بنائی کہ پچاس ہزار انسان بیٹھ کر انسانوں اور درندوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھ سکیں۔ دوسری طرف لاہور کی بادشاہی مسجد ہے جو اس غرض سے تعمیر کی گئی ہے کہ ایک لاکھ بندگانِ خدا جمع ہو کر مساوات، اخوت اور محبت کے سچے اور مخلصانہ جذبات کا مظاہرہ کر سکیں۔ اس ایک مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کتنی برکات کا سرچشمہ ہے۔"

28 نومبر کو آپ نے نیپلز کے کھنڈروں کی سیر کی اور عجائب گھر دیکھا۔
29 نومبر کو مصر کے لئے روانہ ہو گئے۔

اقبال ۔۔۔ مصر میں

قاہرہ میں آپ کی رہائش کا انتظام میٹروپولیٹن ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالحمید سعید بے نے رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس موقع پر مصری اخبار نویسوں نے آپ کو مجبور کر دیا کہ مصری نوجوانوں کی تنظیم "شبانِ مصر" کے نام کوئی مختصر پیغام ضرور جاری کریں۔ چنانچہ آپ نے ایک کاغذ پر اپنا یہ پیغام لکھ دیا: "مصر کے نوجوانوں سے میری درخواست ہے کہ وہ رسول کریم ﷺ کے وفادار رہیں۔"

ایک روز مصر کی بزرگ شخصیت سید محمد قاضی ابوالعزائم اپنے دونوں بیٹوں کی معیت میں علامہ سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ علامہ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "آپ نے کیوں تکلیف کی، میں خود آپ کی زیارت کے لئے آپ کے پاس چل کر آتا"۔ فرمانے لگے: "خواجۂ دو جہاں آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس نے دین سے تمسک حاصل کیا ہو، اس کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہوگی۔" یہ بات سن کر علامہ بے تاب ہو گئے اور ان کے رخصت ہونے کے بعد روتے ہوئے فرمانے لگے: "کیا زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گنہگار کو متمسک بالدین سمجھ کر آنحضور ﷺ کے ارشاد کے اتباع میں بغرض خوشنودئ رسولؐ ملنے آئے ہیں۔"

مصر میں آپ کی ملاقات مشہور صحافی اور تاریخ دان ڈاکٹر محمد حسین ہیکل سے بھی ہوئی۔ 4 دسمبر کی شام کو آپ نے "شبان المسلمین" سے انگریزی میں خطاب کیا۔ اگلے روز مسجد عمرو بن العاص پہنچے۔ امام شافعی کے مزار پر آپ دیر تک قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہے۔ جامعۂ ازہر پہنچے اور کچھ دیر منطق، تفسیر اور حدیث کے دروس میں شریک رہے۔

اقبال ۔۔۔ فلسطین میں

6 دسمبر کو یہ حضرات بیت المقدس پہنچے۔ استقبال کے لئے خود مفتی اعظم امین الحسینی تشریف لائے۔ مؤتمر عالم الاسلامی کے افتتاحی اجلاس میں دنیا کے ہر اسلامی ملک کے نمائندے شریک تھے۔ اجلاس کے بعد تمام شرکاء مسجد اقصیٰ کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں آپ نے رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ پھر مسجد اقصیٰ پہنچ کر نماز مغرب ادا کی گئی۔ نماز عشاء کے بعد مفتی اعظم نے اپنا خطبہ پڑھا۔ ان کے بعد اقبال نے تقریر کی۔ دوسرے اجلاس میں عہدہ داروں کا انتخاب ہوا۔ مفتی اعظم اتفاق رائے سے صدر منتخب ہوئے۔ چار نائب صدر منتخب کئے گئے جن میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔ اقبال نے بعد میں "فلسطینی عرب سے" خطاب کرتے ہوئے ایک مختصر نظم بھی لکھی۔

زمانہ اب بھی نہیں، جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے، نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے، غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے!

تیسری گول میز کانفرنس

جب دوسری گول میز کانفرنس بھی ہندوستان کے آئینی مسائل حل نہ کر سکی تو حکومت انگلستان نے تیسری گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا۔ یہ کانفرنس 17 نومبر 1932ء کو شروع ہوئی اور 24 دسمبر کو ختم ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس کانفرنس میں شرکت کے علاوہ نپولین کے مزار پر حاضری دی، مشہور محقق میگ نون سے ملاقات کی، جس نے دلائل سے ثابت کیا تھا کہ دانتے کی تصنیف Divine Comedy اسلامی روایات و حکایات سے ماخوذ ہے۔ پھر مشہور فلسفی برگساں سے بھی طویل ملاقات کی اور اس کے نظریۂ زماں پر بحث کی، جسے

ابتدا کی انتہا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے۔ اسی کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے۔ میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز و گداز سب اسی کا فیضان ہے۔''

سفر افغانستان کے علاوہ درونِ ملک بھی کئی شہروں کے دورے کئے۔ متعدد بار بھوپال گئے۔ حیدرآباد دکن گئے۔ علی گڑھ' کشمیر اور پانی پت گئے۔ دسمبر **1928**ء میں ''مدراس مسلم ایسوسی ایشن'' کی دعوت پر مدراس گئے جہاں آپ کا قیام تین یوم تک رہا۔ وہاں آپ نے تین لیکچر دیئے۔ باقی تین لیکچر حیدرآباد میں دیئے۔ یہ چھ لیکچر انگریزی میں تھے۔ بعد میں Reconstruction of Religious Though s in Islam کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپے اور اردو میں ترجمہ ہوئے۔ **1934**ء میں سرہند کا سفر کیا اور حضرت مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری دی۔ اس سفر میں آپ کے ہمراہ آپ کے فرزند جاوید اقبال بھی تھے' جن کی عمر اس وقت تقریباً دس سال تھی۔ سرہند جانے کے متعلق سید نذیر نیازی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آج شام کی گاڑی سے سرہند جا رہا ہوں۔ چند روز ہوئے' صبح کی نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے یہ پیغام دیا:

> ہم نے جو خواب تمہارے اور شکیب ارسلان (اتحاد اسلامی کے زبردست داعی) کے متعلق دیکھا ہے وہ سرہند بھیج دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

پیغام دینے والا معلوم نہیں ہو سکا کہ کون ہے۔ اسی خواب کی بناء پر وہاں کی حاضری ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جب جاوید پیدا ہوا تھا تو میں نے عہد کیا تھا کہ جب وہ ذرا بڑا ہوگا تو اسے حضرت مجدد کے مزار پر لے جاؤں گا۔ وہ بھی ساتھ جائے گا' تاکہ یہ عہد بھی پورا ہو جائے۔''

آخری ایام

عمر کے آخری حصے میں علامہ اقبال کو مختلف بیماریوں نے آ لیا۔ ادھر ان کی بیگم (والدہ جاوید) کی علالت کی وجہ سے ان کی پریشانیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ چنانچہ آپ وکالت کا کام جاری نہ رکھ سکے۔ یوں آپ کی آمدنی گھٹ گئی اور گزر اوقات مشکل سے ہونے لگی۔ علامہ اقبال کے دوست سر راس مسعود آپ کی مالی پریشانیوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ انہی کی کوششوں سے نواب بھوپال کی طرف سے پانچ سو روپے وظیفہ مقرر کیا گیا۔ شکریئے کے طور پر سر راس مسعود کو خط لکھا: ''خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام ان کی خواہش کے مطابق قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا۔''

دولتِ آصفیہ (حیدرآباد دکن) کے مدار المہام سر اکبر حیدری نے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا۔ اس چیک کے ساتھ ایک خط بھی تھا جس میں سر اکبر حیدری کی طرف سے لکھا تھا: ''یہ رقم شاہی توشے خانے سے ہے جس کا انتظام میرے ذمہ ہے۔ بطور تواضع بھیجی جا رہی ہے۔''

''جس کا انتظام میرے ذمہ ہے'' کے الفاظ علامہ اقبال کی خوددار طبیعت پر گراں گزرے۔ چنانچہ آپ نے یہ کہہ کر کہ شاید آپ لوگوں نے مجھے نہیں سمجھا' چیک واپس کر دیا۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر آپ نے ایک مختصر سی نظم بھی لکھی' جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہِ پرویز
دو قلندر کو' کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر
حسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بارِ امانت کو اٹھاتا سرِ دوش
کامِ درویش میں ہر تلخ ہے مانندِ نبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

صحت کی طرف سے جب مایوسی ہو گئی تو انہوں نے بچوں (جاوید اور منیرہ) کی تولیت بعض عزیزوں اور دوستوں کو سونپ دی۔ رشید احمد صدیقی کی مساعی سے ایک جرمن خاتون نے ان کا گائیڈ بننا قبول کر لیا۔ **1937**ء کے موسم گرما میں مس ڈورالینڈ نے' جسے عام طور پر بیگم حسین کے نام سے پکارا جاتا تھا' ''جاوید منزل'' کا چارج سنبھال لیا اور یوں علامہ اقبال کو ایک بڑی فکر سے نجات حاصل ہوئی۔

حج کی خواہش ناتمام

آخری عمر میں علامہ اقبال کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح حج کر لیں اور مدینۂ منورہ میں روضۂ نبویؐ پر حاضری دے سکیں۔ ایک دفعہ عبدالرحمان طارق صاحب آپ سے ملنے کے لئے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر گئے۔ سردیوں کے دن تھے اور آپ برآمدے میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ طبیعت پر ایک کیف اور وجد کا عالم طاری تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ بار بار آسمان کی طرف انگشتِ شہادت اٹھاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

(آسمان کے نیچے ایک ایسی ادب گاہ ہے جو عرش سے بھی نازک تر ہے۔ یہاں تو جنید اور بایزید جیسی بزرگ ہستیاں بھی ادب و احترام سے دم بخود حاضر ہوتی ہیں۔)

تقریباً پندرہ منٹ تک یہی عالم رہا۔ جب طبیعت قدرے بحال ہوئی تو طارق صاحب نے عرض کیا: ''آپ ادب گاہِ مدینہ کی زیارت کے لئے مدت سے بے چین ہیں۔ اس آرزو کو کب عملی جامہ پہنائیں گے؟''

ایک آہِ سرد بھر کر فرمایا: ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حج کے لئے بھی کچھ شرائط عائد کر رکھی ہیں۔ ان میں سے اہم ترین شرائط یہ ہیں کہ انسان کسی کا مقروض نہ ہو' والدین اور بیوی بچوں کے لئے خرچ چھوڑ جائے اور حج کے لئے اس قدر زادِ راہ لے کر جائے کہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ میرے پاس نہ اتنی گنجائش ہے اور نہ میں یہ آرزو پوری کر سکتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ فراقِ رسولؐ میں مرغِ بسمل کی مانند تڑپ رہا ہوں اور اسی سوز و درد کا شب و روز لطف لیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے علامہ کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو ٹپکنے لگے اور اپنی یہ رباعی دو تین مرتبہ پڑھی۔

غمِ راہی نشاط آمیز تر کن
فغانش را جنوں آمیز تر کن
بگیر اے ساربان راہِ درازے
مرا سوزِ جدائی تیز تر کن

(اے ساربان راہِ حجاز! اس راہی کے غم میں نشاط و خوشی کا مزید اضافہ کر' اور اس کے آہ و فغاں میں کچھ اور جنونِ عشق شامل کر۔ اے ساربان! منزلِ محبوب کی جانب کوئی راہ دراز اختیار کر اور یوں میرے سوزِ جدائی کو اور بھی تیز کر دے۔)

وفات سے کچھ عرصہ پہلے بہاولپور کے ایک پیر صاحب کو حج کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر آپ کا شوق اور بھی تیز ہو گیا۔ آپ نے سفرِ حج کے لئے باقاعدہ تیاریاں شروع کر دیں۔ کسی نے کہا' صحت کی خرابی کے علاوہ آپ کی آنکھوں سے بھی پانی اتر رہا ہے۔ اس حالت میں آپ حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں۔ اس پر آپ نے پُرجوش لہجے میں فرمایا: ''آنکھوں کا کیا ہے! آخر اندھے بھی تو حج کر آتے ہیں۔''

آخری بیماری

آخری عمر میں جبکہ علامہ کی بائیں آنکھ بھی جواب دے چکی تھی' ان کا حافظہ بہت تیز ہو گیا تھا' اور انہیں اس بات پر کوئی افسوس نہ تھا کہ وہ کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ بیماری میں بھی خطوں کا جواب باقاعدگی سے لکھواتے تھے۔ کبھی جاوید سے' کبھی نذیر نیازی صاحب سے اور کبھی کسی اور دوست سے خط لکھواتے۔ اب ان کی دلچسپی کے دو محور تھے۔ اوّل یہ کہ مسلمانوں کی بہتری کے لئے کہاں کیا کچھ ہو رہا ہے یا کچھ کرنا چاہئے۔ دوم یورپ کے سیاسی حالات کیا کروٹ بدل رہے ہیں۔ چونکہ انہیں جنگ عظیم دوم کے برپا ہونے کا یقین تھا' اس لئے یورپ کے حالات خاص طور پر پڑھوا کر سنتے تھے۔ جب کوئی شخص ان کی مزاج پُرسی اور عیادت کے لئے آتا تو اس سے یہ ضرور پوچھتے ''آج کیا خبر ہے؟''

بیماری کی حالت میں ایک رات کافی دیر تک گریہ زاری کرتے رہے۔ کسی نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا:

''خدا جانے مسلمان قوم کا کیا حشر ہو گا۔ مجھے اس کا خیال رہ رہ کر ستاتا ہے۔''

جب سے بیماری میں شدت آئی تھی' صبح کی تلاوت چھوٹ گئی تھی۔ آپ کسی سے قرآن پڑھوا کر سن لیتے۔ اس دوران میں آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے رہتے۔ تلاوت کے چھوٹ جانے کا ذکر اس شعر میں کس حسرت سے کیا ہے۔

در نفس سوزِ جگر باقی نماند
لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

ایک دفعہ علی بخش سے کہا کہ نماز پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ نماز کے لئے وہ خود تو وضو نہیں کر سکتے تھے' علی بخش نے لیٹے لیٹے انہیں وضو کرا دیا۔ چنانچہ آپ نے چارپائی پر بیٹھ کر نماز پڑھی۔

3 مارچ 1938ء کو ضعف قلب اس قدر بڑھ گیا کہ غشی طاری ہو گئی۔ چنانچہ حکیم قرشی کا علاج شروع کیا گیا جس سے حالت ذرا سنبھل گئی' لیکن یہ کیفیت دیر تک قائم نہ رہی اور تکلیف عود کر آئی۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے تسکین کے چند کلمات کہے تو علامہ نے فوراً جواب دیا: ''میں مسلمان ہوں اور موت سے نہیں ڈرتا''۔ اس کے بعد اپنا یہ شعر پڑھا۔

نشان مرد مومن باتو گویم
چو مرگ آید' تبسم بر لب اوست

ایک دفعہ ممتاز حسین انہیں ملنے کے لئے آئے۔ اپنی بیماری کے بارے میں عجیب و غریب توجیہہ کرتے ہوئے آپ نے قدرے مسکرا کر کہا: ''یہ جو میں زندگی اور کائنات کے بڑے بڑے راز آپ لوگوں کو بتاتا ہوں' یہ بیماری اس کی سزا ہے۔''

بیماری کی حالت میں ایک رات کافی دیر تک گریہ زاری کرتے رہے۔ کسی نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا: ''خدا جانے مسلمان قوم کا کیا حشر ہو گا۔ مجھے اس کا خیال رہ رہ کر ستاتا ہے۔''

19 مارچ کو پاؤں پر ورم آ گیا اور جگر نے اپنا فعل سرانجام دینا کم کر دیا۔

25 مارچ کو بیماری نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی۔

20 اپریل کو آغا مرتضیٰ احمد خاں عیادت کے لئے آئے۔ عین اسی وقت جاوید اقبال جو اس وقت تیرہ سال کے تھے' کمرے میں وارد ہوئے۔ علامہ نے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''بیٹا! تم میرے پاس آ کر بیٹھا کرو۔ میں شاید چند روز کا مہمان ہوں۔''

حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ ابھی کم عمر ہے' اس لئے آپ کی بیماری سے گھبرایا گھبرایا رہتا ہے۔ علامہ نے فرمایا: ''اسے ہر افتاد کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنی چاہئے۔''

20 اپریل کی رات علامہ اقبال کے پاس م ش (میاں محمد شفیع)' ڈاکٹر عبدالقیوم اور راجہ حسن اختر موجود تھے۔ آخری رات کے متعلق جاوید اقبال اپنی تصنیف ''مئے لالہ فام'' میں لکھتے ہیں:

''آخری رات عقیدت مندوں کا جمگھٹا تھا۔ میں کوئی دو بجے ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ پوچھا: ''کون ہے؟'' میں نے جواب دیا: ''جاوید ہوں''۔ ہنس پڑے اور بولے: ''جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں''۔ پھر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چوہدری محمد حسین سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اسے جاوید نامہ کے آخر میں وہ دعا'' خطاب بہ جاوید'' ضرور پڑھوا دیجئے۔''

شانوں میں درد ہونے لگا تو علامہ نے علی بخش کو شانے دبانے کے لئے کہا۔ پھر اچانک لیٹے لیٹے اپنے پاؤں پھیلا دیئے۔ اوپر کی طرف آنکھیں اٹھائیں' بایاں ہاتھ دل پر رکھا اور دائیں ہاتھ سے سر کو تھامتے ہوئے کہا: ''یا اللہ''۔ اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف ڈھلک گیا' اور قبلہ رُو ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پانچ بج کر چودہ منٹ پر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ

وفات سے دس منٹ پہلے اقبال نے اپنے بارے میں یہ رباعی کہی تھی جو وصال کے وقت آپ کے ہونٹوں پر جاری تھی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز' آید کہ ناید

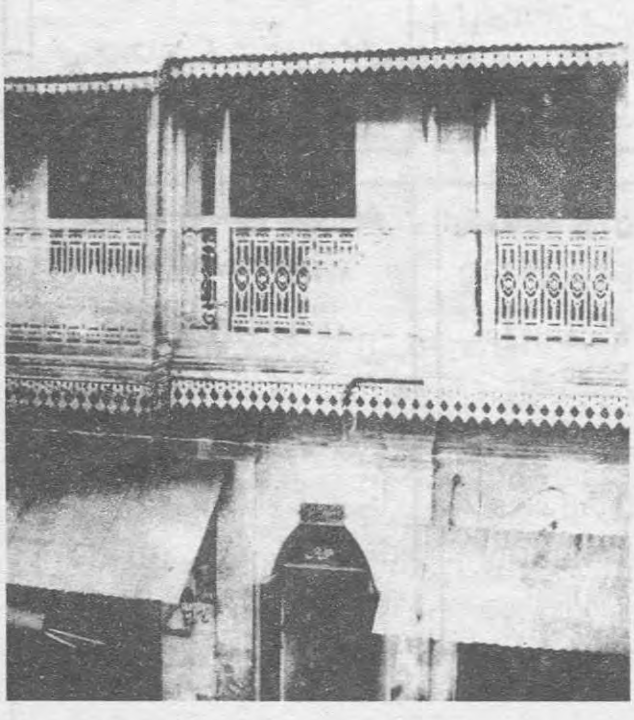

علامہ اقبال کا سیالکوٹ میں آبائی گھر

انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کی کاوشیں

کیسٹ کلب اسکیم

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

کے ایمان افروز خطابِ جمعہ کا کیسٹ

شہر کراچی میں ہر ہفتہ آپ کے گھر

پہنچانے کی اسکیم

سالانہ ممبر شپ فیس: 500 روپے

آسان عربی گرامر

ویڈیو کیسٹس/VCDs

گھر بیٹھ کر عربی گرامر کے قواعد سیکھیے یا کسی بھی مقام پر عربی گرامر کلاسز منعقد کیجیے۔

مکمل عربی گرامر کی تدریس

28 ویڈیو کیسٹس/84 VCDs

میں دستیاب ہے

"قواعدِ تجوید

ویڈیو کیسٹ"

قرآنِ حکیم کی درست تلاوت کے لئے قواعدِ تجوید کا علم ضروری ہے۔

''قواعدِ تجوید'' کے موضوع پر کتابچہ کی تدریس ایک ماہر فن استاد کے تعاون سے ایک ہی ویڈیو کیسٹ میں دستیاب ہے۔

سود

حرمت۔ خباثتیں۔ اشکالات

ایک مختصر لیکن نہایت جامع اور مفید کتاب جس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں سود سے متعلق تمام ضروری و بنیادی معلومات اور اعتراضات کے مدلل جوابات شامل کیے گئے ہیں۔

منتخب نصاب حصہ اوّل

نکات برائے درس و تدریس

دینِ اسلام اور اس کے تقاضوں کے فہم کے لئے منتخب نصابِ قرآنی کی درس و تدریس انتہائی مفید ہے۔

منتخب نصاب حصہ اول۔ نکات کی صورت میں آیات کا لفظی ترجمہ، تمہیدی و تفسیری تفاصیل موضوع سے متعلق قرآنِ کریم کی دیگر آیات واحادیث کے حوالہ جات

چہرے کا پردہ

علماء و مشائخ، مفکرین اور ادباء کے مستند مضامین کا ایک گراں قدر مجموعہ

قرآن وسنت کی روشنی میں شرعی پردے کے احکامات، اِن احکامات کی حکمت، چہرے کے پردے کے لئے دلائل، اُمت کا متواتر عمل اور اس حوالے سے اشکالات و اعتراضات کے جوابات کتابی صورت میں

"سیرت النبیؐ کی اہم ترین رہنمائی"

کے موضوع پر ویڈیو کیسٹ

موجودہ حالات میں سیرت النبیؐ کی اہم ترین رہنمائی کے موضوع پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ایک اہم اور جامع خطاب کی انتہائی دیدہ زیب اور خوبصورت ریکارڈنگ ایک ہی ویڈیو کیسٹ میں

ایک سالہ قرآن فہمی کورس

دنیا اور آخرت کی کامیابی کے حصول کے لئے دینی و جدید علوم کا سیکھنا ضروری ہے۔

جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کو قواعدِ تجوید، عربی گرامر، ترجمہ و تفسیرِ قرآن و حدیث اور دینی و تحریکی لٹریچر کی تعلیم کا اہتمام باصلاحیت اساتذہ کے زیرِ نگرانی۔

آغاز ہر سال رمضان المبارک کے بعد

لائبریریز اور مکتبہ جات کے پتے

1- 11۔ داؤد منزل، نزد فریسکو سوئیٹ، آرام باغ

2- حق اسکوائر، عقب اشفاق میموریل ہسپتال، یونیورسٹی روڈ، گلشن اقبال

3- قرآن مرکز، نزد مسجد طیبہ، سیکٹر 35/A، کورنگی نمبر 4

4- فلیٹ نمبر 2، محمدی منزل، بلاک "K"، نارتھ ناظم آباد

5- C-113، مادام اپارٹمنٹس، نزد چھوٹا گیٹ، ایئر پورٹ

6- قرآن اکیڈمی، لیسین آباد، فیڈرل بی ایریا

7- متصل محمدی آٹوز، اسلام چوک، سیکٹر 111/2، اورنگی ٹاؤن

8- رضوان سوسائٹی بس اسٹاپ، یونیورسٹی روڈ

قرآن اکیڈمی، DM-55، خیابانِ راحت، درخشاں، ڈیفنس فیز 6، کراچی

فون: 23-5340022 فیکس: 5840009 ای میل: karachi@quranacademy.com ویب سائٹ: www.quranacademy.com

3- پیامِ مشرق

یہ بھی فارسی زبان میں ہے۔ 1922ء کے اواخر میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب جرمن شاعر گوئٹے کی تصنیف "پیامِ مغرب" کے جواب میں لکھی گئی۔ گوئٹے نے مشرقی ادبیات کا مطالعہ کیا تھا' بالخصوص مولانا روم کی مثنوی سے کافی استفادہ کیا' لیکن ان کے فلسفے کے بہت سے حصوں سے اتفاق نہیں کیا اور اپنی ساری کوشش یہ ثابت کرنے میں صرف کر دی کہ مغرب ہی دنیائے انسانیت کے مسائل حل کرنے کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس سے علامہ اقبال کے جذبۂ ملی کو ٹھیس پہنچی اور انہوں نے گوئٹے کی تردید کرتے ہوئے ثابت کیا کہ جس علم سے آج مغرب فیض اٹھا رہا ہے' وہ مشرق کا اور خصوصاً مسلمانوں کا ورثہ ہے۔

"پیامِ مشرق" کا انتساب افغانستان کے ایک سابق فرماں روا امیر امان اللہ خان نیازی کے نام کیا گیا ہے' جس کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کتاب کے دیباچے میں لکھا:

> "اس وقت دنیا میں اور بالخصوص مشرقی ممالک میں ہر ایسی کوشش' جس کا مقصد افراد و قوم کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو' قابلِ احترام ہے۔ اسی بنا پر میں نے ان چند اوراق کو اعلیٰ حضرت فرماں روائے افغانستان کے نام نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں' اور افغانوں کی تربیت خاص طور پر ان کے مدنظر ہے۔ اس عظیم الشان کام میں خدا تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔"

"پیامِ مشرق" کے پہلے ایڈیشن پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ اس میں اہلِ عجم ہی کو کیوں مخاطب کیا گیا ہے اور عجم ہی کی بہتری کیوں چاہی گئی ہے۔ چنانچہ دوسرے ایڈیشن میں اس اعتراض کے پیشِ نظر علامہ اقبال نے صفحۂ اول پر یہ آیت لکھوا دی: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ﴾

اس کتاب میں وہ معارف بیان کئے گئے ہیں جو افراد اور اقوام کی باطنی تربیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ قوموں کے زوال' اجتماعی افسردگی' سیاستِ حاضرہ کی فریب کاریوں اور یورپ میں انسانیت کی مٹی پلید کئے جانے کے ذکر کے ساتھ ساتھ تسخیرِ کائنات' میلادِ آدم' افکارِ ابلیس' ہبوطِ آدم اور قیامت کا قصہ فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ 1956ء میں "پیامِ مشرق" کا فرانسیسی ترجمہ سیروو ڈچ ایرانے کیا۔

4- بانگِ درا

یہ علامہ اقبال کا اولین اردو شعری مجموعہ ہے جو پہلی مرتبہ 1924ء میں شائع ہوا۔ یورپ سے واپس آنے کے بعد علامہ کا ذوقِ سخن اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ انہیں اپنے ابتدائی دور کے اشعار دیکھ کر ندامت سی محسوس ہوتی تھی اور وہ اپنے اس سارے دفتر کو تلف کرنا چاہتے تھے۔ اس دوران میں ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ اردو کلام شائع کیا جائے۔ 10 دسمبر 1923ء کو مولانا ظفر علی خان نے اپنے اخبار "زمیندار" کے اداریے میں علامہ پر زور دیا کہ وہ اپنا اردو کلام اشاعت کے لئے پریس میں دے دیں۔ چنانچہ انہیں اپنے عقیدت مندوں کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ ابھی وہ ابتدائی تیاریاں کر رہے تھے کہ حیدر آباد دکن کے مولوی عبدالرزاق نے علامہ سے اجازت لئے بغیر حیدر آباد سے "کلیاتِ اقبال" شائع کر دی۔ اقبال نے اس غیر قانونیت اور بے قاعدگی کا فوری نوٹس لیا' لیکن سر اکبر حیدری کے توسط سے ایک ہزار روپے رائلٹی طے ہو جانے کے بعد علامہ نے انہیں اس شرط پر "کلیاتِ اقبال" فروخت کرنے کی اجازت دے دی کہ وہ اس کی فروخت کو حیدر آباد تک ہی محدود رکھیں گے۔

"بانگِ درا" علامہ اقبال کی تمام تخلیقات میں سب سے مقبول اور سب سے زیادہ فروخت ہونے والا مجموعۂ کلام ہے۔

5- زبورِ عجم

اس کا پہلا ایڈیشن جون 1927ء میں شائع ہوا۔ علامہ اقبال نے پہلے اس کتاب کے لئے "زبورِ جدید" کا نام تجویز کیا تھا' لیکن بعد میں "زبورِ عجم" رکھا گیا۔ اس مجموعے میں فارسی کی 66 غزلیں ہیں' جن میں عشق' عاشق' معشوق' شراب' جام' صراحی اور رُخسار کی پرانی عجمی اصطلاحات کو بالکل نئے معنی اور پیرائے میں استعمال کیا گیا ہے۔ اب عشق کا تعلق عاشق اور معشوق سے نہیں رہا بلکہ انسان' خدا اور اقبال کی مثلث کے اندر ہی گھومتا ہے۔ اب عشق سے مایوسی اور قنوطیت پیدا نہیں ہوتی' بلکہ رجائیت اور اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ "زبورِ عجم" کا دوسرا حصہ "گلشنِ رازِ جدید" کے نام سے شامل ہے جو مثنوی کی طرز پر تصوف کے موضوع پر شیخ محمود شبستری کی مشہور تصنیف "گلشنِ راز" کے جواب میں لکھی گئی۔ تیسرا حصہ "بندگی نامہ" ہے' جس میں انہوں نے غلامی کے برے اثرات سے بچنے کی تلقین کی ہے اور آزادی کے لئے ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کیا ہے اور اسی حوالے سے آزاد اور غلام قوموں کے فنِ تعمیر اور دیگر فنونِ لطیفہ پر تبصرہ کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی "زبورِ عجم" بدحال اور بے آسرا افراد کی اخلاقی پستیوں کا تذکرہ ہے' جس کے ذریعے انہیں مایوسی سے نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

6- جاوید نامہ

علامہ اقبال نے اٹلی کے شاعر دانتے کی شاعرانہ تصنیف "ڈیوائن کامیڈی" کے جواب میں' تین سال کی شبانہ روز محنت شاقہ کے بعد "جاوید نامہ" لکھ کر 1932ء میں شائع کیا۔ یہ دراصل "معراج نامہ" ہے' جس میں علامہ تخیل کے پر لگا کر افلاک کی سیر کرتے ہیں۔ اس ذہنی و روحانی معراج کے دوران ان کی ملاقاتیں کئی مسلم اور غیر مسلم مشاہیر سے ہوتی ہیں۔ مسلم مشاہیر کے ساتھ ساتھ غیر مسلم مشاہیر کا ذکر کرنا علامہ اقبال کی

"جاوید نامہ" میں علم' عقل اور عشق کا موازنہ پیش کیا گیا ہے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑنے والوں کا بھی ذکر ہے۔ کشمیر جنت نظیر کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا بیان بھی ہے۔ کتاب کے آخر میں "خطاب بہ جاوید" (سخنے بہ نژادِ نو) شامل ہے جو نوجوانوں کے نقطۂ نظر سے خاص چیز ہے۔

وسیع المشربی اور وسعتِ قلبی کی دلالت کرتا ہے۔ "جاوید نامہ" میں علم' عقل اور عشق کا موازنہ پیش کیا گیا ہے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے لڑنے والوں کا بھی ذکر ہے۔ کشمیر جنت نظیر کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا بیان بھی ہے۔ کتاب کے آخر میں "خطاب بہ جاوید" (سخنے بہ نژادِ نو) شامل ہے جو نوجوانوں کے نقطۂ نظر سے خاص چیز ہے۔ "جاوید نامہ" علامہ اقبال کی نہایت اہم تصنیف ہے۔ اس کا ترکی زبان میں ترجمہ ڈاکٹر اینی میری شمل نے 1958ء میں انقرہ سے شائع کیا۔ اٹلی میں بوسانی نے اسے جرمن زبان میں منتقل کیا۔

7- بالِ جبریل

یہ اردو کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جو "بانگِ درا" کی اشاعت کے گیارہ سال بعد 1935ء میں شائع ہوا۔ پہلے اس مجموعے کا نام "نشانِ منزل" تجویز ہوا تھا۔ "بالِ جبریل" کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی فکر اس آخری نقطے تک پہنچ چکی ہے جو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا مقامِ اتصال ہے۔ یہ نوری نقطہ انسان کی "خودی" ہے۔ اقبال نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو طرح طرح سے اپنی جولان گاہِ فکر بنایا ہے اور شاعرانہ

لطافتِ بیان سے اِس خشک اور سنجیدہ ترین عقدے کی گرہ کشائی میں طبعِ رسا اور توجہ کامل کی تمام توانائیاں اور رعنائیاں صرف کر دی ہیں۔

8- مثنوی مسافر

یہ مثنوی 1934ء میں شائع ہوئی۔ یہ فارسی میں ہے۔ والئ افغانستان نادر شاہ نے افغانستان میں تعلیمی اصلاحات کی غرض سے ہندوستان کی تین مقتدر شخصیتوں کو افغانستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ علامہ اقبال کے علاوہ سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی بھی شریکِ سفر تھے۔ علامہ اقبال نے افغانستان کا سفر کرنے کے بعد اپنے تاثرات اس ''مثنوی'' کی صورت میں ظاہر کئے تھے۔

9- ضربِ کلیم

''بانگِ درا'' کے بعد علامہ کی شاعری کا ارتقائی زینہ ''بالِ جبریل'' اور ''ضربِ کلیم'' ہیں جو ''بانگِ درا'' ہی کے بطن سے ظہور پذیر ہوئے۔ ان دونوں مجموعوں کا دائرہ فکر زیادہ وسیع اور آفاق گیر ہے۔ ''بالِ جبریل'' کی اشاعت سے اگلے برس 1936ء میں ''ضربِ کلیم'' شائع ہوئی۔ ''ضربِ کلیم'' میں اقبال کے دل و دماغ پر فلسفہ اپنی بھرپور طاقت سے غالب نظر آتا ہے اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس مقام پر وہ ایک بے نظیر متکلم کی طرح دکھائی

''ضربِ کلیم'' میں اقبال کے دل و دماغ پر فلسفہ اپنی بھرپور طاقت سے غالب نظر آتا ہے اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس مقام پر وہ ایک بے نظیر متکلم کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ فلسفہ تشکیک کی گرد سے آلودہ ہے لیکن اعلیٰ علم کلام دلیل و برہان کی رو سے مسائل سلوک و عرفان کا حل پیش کرتا ہے۔

دیتے ہیں۔ فلسفہ تشکیک کی گرد سے آلودہ ہے لیکن اعلیٰ علم کلام دلیل و برہان کی رو سے مسائل سلوک و عرفان کا حل پیش کرتا ہے۔

پہلے اس مجموعے کے لئے ''صورِ اسرافیل'' کا نام تجویز ہوا تھا لیکن بعد میں یہ نام ''ضربِ کلیم'' سے بدل دیا گیا۔ یہ کتاب نواب سر حمید اللہ خان آف بھوپال کے نام سے منسوب ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ خواجہ عبدالحمید عرفان نے 1957ء میں کیا۔ انگریزی ترجمے کی سعادت 1947ء میں وی ایس کرنان کو حاصل ہوئی جنہوں نے اسے نہایت اہتمام کے ساتھ بمبئی سے شائع کیا۔

10- پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق

یہ فارسی مثنوی 1936ء میں ''ضربِ کلیم'' کی اشاعت کے فوراً بعد شائع ہوئی۔ اس مثنوی کی تخلیق کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ 13 اپریل 1936ء کو علامہ اقبال بھوپال کے شیش محل میں سوئے ہوئے تھے کہ رات کے تین بجے سر سید نے ان سے خواب میں پوچھا: ''اقبال! تم کب سے بیمار ہو؟'' علامہ نے جواب دیا: ''دو سال سے''۔ سر سید نے فرمایا: ''حضور رسالت مآب ﷺ کے حضور کیوں التجا نہیں کرتے''۔ اس پر ان کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے عرضداشت کے طور پر چند اشعار کہے جو بعد میں مثنوی کی شکل اختیار کر گئے۔

11- ارمغانِ حجاز

یہ علامہ کی آخری کتاب ہے جس کا کچھ حصہ اردو میں ہے اور باقی فارسی میں۔ اس طرح یہ دو کتابیں ہو گئیں۔ یہ علامہ کی وفات کے بعد نومبر 1938ء میں شائع ہوئی۔ حج پاک کا جذبہ اس تصنیف کا محرک بنا۔ علامہ چاہتے تھے کہ وہ حج کے دوران حضور پاک ﷺ کے روضۂ مبارک پر حاضر ہو کر یہ کتاب خود پیش کریں، لیکن افسوس کہ قضا نے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ اس کتاب میں علامہ کے نظریات و خیالات کا جوہر موجود ہے۔ ''ارمغانِ حجاز'' پانچ موضوعات پر مشتمل ہے:

1۔ حضورِ حق　2۔ حضورِ رسالت　3۔ حضورِ ملّت
4۔ حضورِ عالمِ انسان　5۔ بہ یارانِ طریق

''ارمغانِ حجاز'' میں کئی رباعیات ایسی بھی ہیں جن میں علامہ کی توحید پرستی کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ شاعر کے کلام میں دل کا سوز اور تڑپ صفحے صفحے پر نمایاں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ مدینہ جانے کے لئے بہت بے قرار ہیں۔ علامہ اقبال اس کتاب کو نواب حمید اللہ خان آف بھوپال کے نام معنون کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جس کا اظہار انہوں نے سر راس مسعود کے نام ایک خط میں کر دیا تھا، مگر سر راس مسعود علامہ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے اور یہ کتاب بھی علامہ اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

''کہ خونِ دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں ہم نے''

حمیرا عبید الرحمٰن

کے مہکتے، چہکتے ۔۔۔ اور ۔۔۔ سسکتے سلگتے

چالیس اصلاحی افسانوں کا مجموعہ

سوزِ درُوں

(سوز و سازِ رومی ۔۔۔ پیچ و تابِ رازی)

۔۔۔ مع خصوصی مضامین ۔۔۔

☆ افسانہ نگاری ۔۔۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی نظر میں

☆ ''تقدیم'' ۔۔۔ از ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

☆ ''حرفے چند'' ۔۔۔ از محترمہ عائشہ منور صاحبہ

☆ ''پیش لفظ'' ۔۔۔ از قاضی عبدالقادر صاحب

اعلیٰ کاغذ، عمدہ طباعت، دیدہ زیب چہار رنگا سرورق

یہ سب کچھ لیکن ۔۔۔ مہنگائی کے اس دور میں ۔۔۔ قیمت صرف: 66 روپے

ہر بڑے کتب فروش یا براہِ راست ہم سے طلب فرمائیں

☆ مکتبہ الہدیٰ، ڈبائی منزل A-577، بلاک J، نارتھ ناظم آباد، کراچی 74700

☆ مکتبہ نور اسلام، رحمٰن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔

☆ مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، K-36 ماڈل ٹاؤن، لاہور۔

نوجوانوں کے لئے پیام اقبال کا ارتقاء

نوجوان یا نئی نسل یا اقبال کی اصطلاح میں ''نژادِنو'' سے کیا مراد ہے؟ نئی اور پرانی نسل میں کیا فرق ہے؟ عموماً ایک نسل کا زمانہ تیس سال کے قریب بتایا گیا ہے۔ جب بچے جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھال لیتے ہیں تو وہ پرانی نسل کا حصہ بننے لگتے ہیں' یعنی تیس پینتیس سال کی عمر تک تو انسان نئی نسل کا نمائندہ ہوتا ہے' اور اس کے بعد پرانی نسل کا فرد بن جاتا ہے' مگر نئی اور پرانی نسل میں امتیاز کرنا اور ان کے درمیان کوئی واضح لکیر کھینچنا ممکن نہیں' کیونکہ ہر لحہ نئی نسل پرانی نسل میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا مستقبل حال میں اور حال ماضی میں تبدیل ہو رہا ہے' اس لئے اگر کسی ایک وقت میں ایک نسل نئی ہوتی ہے تو ذرا آگے چل کر وہی نسل پرانی ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نئی اور پرانی نسل (بچے' جوان' بوڑھے) بیک وقت موجود ہوتی ہیں۔ مگر جو بات یہاں خاص طور پر ذہن نشین ہونی چاہئے' وہ یہ ہے کہ نئی نسل اپنے جذباتی اور فکری رویوں میں پرانی نسل سے مختلف ہوتی ہے۔ نئی نسل کے افراد میں فکر کی کمی اور جذبے کی فراوانی ہوتی ہے' جبکہ پرانی نسل میں جذبے کی کمی اور فکر کی زیادتی ہوتی ہے۔ وہ سوچتے زیادہ مگر عمل کم کرتے ہیں۔ اس اصول میں استثناء کی گنجائش موجود رہتی ہے' مگر عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ نئی نسل کے افراد ''نوجوان'' ہوتے ہیں اور ان کے جسم میں زیادہ توانائی ہوتی ہے' اس لئے وہ اپنے مستقبل سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ ایک نوجوان کو مادی دولت کی اتنی پروا نہیں ہوتی' جتنی ایک بوڑھے شخص کو ہوتی ہے۔ نئی نسل عموماً مالی و اقتصادی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتی ہے اور اسے اپنے آپ پر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ دولت کے بغیر بھی زندگی بسر کر سکتی ہے' جبکہ پرانی نسل دولت کو بیساکھی کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ دراصل عملی زندگی (اور خصوصاً پرانی نسل) نے نوجوانوں کو یہی سبق پڑھایا ہوتا ہے کہ دولت زندگی کی سب سے بڑی قدر ہے اور اس سے سارے کام بنائے یا بگاڑے جا سکتے ہیں' مگر نوجوان مادی دولت کے اس طلسماتی اثر سے آزاد ہوتے ہیں' کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوتِ بازو سے دولت پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ شادی بیاہ کے معاملے میں جہاں پرانی نسل جہیز وغیرہ کا مطالبہ کرتی ہے' وہاں نئی نسل پیسے کی بجائے محبت کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان دولت سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ بوڑھے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں' جبکہ نوجوان بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑتے ہیں۔ پرانی نسل عقل کے سہارے چلتی ہے تو نئی نسل جذبے (بقولِ اقبال ''عشق'') کی قوت سے انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی تمام امیدیں نئی نسل سے وابستہ کر دی ہیں۔ چنانچہ وہ نوجوانوں کے لئے دعا مانگتے ہیں۔ اے خدا ؏ جوانوں کو پیروں کا استاد کر!

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ نئی نسل کے کچھ افراد ذہنی طور پر پرانی نسل سے' اور اسی طرح پرانی نسل کے کچھ افراد ذہنی طور پر نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا نئی اور پرانی نسل کا ذکر کرتے ہوئے عمر سے زیادہ ''رویے'' کو اہمیت حاصل ہے۔ عمر کا وہ حصہ جہاں نئی اور پرانی نسل کا سنگم ہوتا ہے' بڑا اہم اور پُر اثر ہوتا ہے۔ زمانہ ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے' مگر بعض افراد زمانے کا ساتھ دینے کی اہلیت رکھتے ہیں اور بعض افراد میں یہ اہلیت نہیں ہوتی۔ جب نوجوان نئی ذمہ داریوں سے آشنا ہوتے ہیں تو اُن پر بڑا نازک وقت ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ''بزمِ انجم'' میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

آئینِ نو سے ڈرنا' طرزِ کہن پہ اَڑنا
منزل یہی کٹھن ہے' قوموں کی زندگی میں

اگر پرانی نسل کے افراد نئے زمانے (نئی نسل) کے تقاضوں کو نہ سمجھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کا ذہنی ارتقا رک گیا ہے۔ ایسی صورت میں نئی اور پرانی نسل میں بُعد (generation gap) پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نئی نسل کے تمام افکار و اعمال درست ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نئی نسل زمانے کے تقاضوں کو نظر انداز کر دے اور اپنے آپ کو غیر ضروری مسائل میں اُلجھا لے۔

علامہ اقبال کے وقت کی نئی نسل آج پرانی ہو چکی ہے' بلکہ اب تو دوسری' تیسری نئی نسل وجود میں آ چکی ہے۔ اقبال کے مخاطب نوجوان دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں یا پیرانہ سالی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے کہ علامہ اقبال کے مخاطب صرف اُن کے عہد کے خاص نوجوان تھے۔ انہوں نے شاہین' نئی نسل' نژادِ نو یا اپنے فرزند جاوید اقبال کے تلازمات کے ذریعے دراصل ہر دور اور ہر عہد کے مسلمان نوجوانوں کو خطاب کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مستقبل میں آنے والے تمام ادوار کے نوجوان بھی اقبال کے پیغام سے مستفید ہوں گے۔ پیامِ اقبال سے صرف وہی نوجوان منحرف ہو سکتے ہیں جو اپنے ماضی سے تعلق توڑ لیں' حال سے تغافل برتیں اور مستقبل سے بے اعتنائی اختیار کریں۔

اقبال کی شاعری تین واضح حصوں میں منقسم ہے۔ اُن کی جوانی کی شاعری' ان کی پختہ سالی کی شاعری اور آخر میں اُن کے بڑھاپے کی شاعری۔ لیکن یہ ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز بات ہے کہ ان تینوں ادوار میں اُن کا مخاطب صرف نوجوان ہے اور موضوعِ سخن بیشتر وہ جذباتی کیفیات رہی ہیں جو جوانی سے خاص ہیں' اور یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بلوغِ فکر کے اعتبار سے اقبال اگرچہ اپنی جوانی ہی میں پختہ سال اور پختہ سالی میں پیرِ دانا ہو چکے تھے' لیکن ان عناصر کے اعتبار سے اُن کی شاعری' اُن کے فلسفے' اُن کے جذبات' اُن کے محسوسات' اُن کے پیغام کے جو بنیادی عناصر ہیں وہ ہمیشہ جوان رہے اور اُن کے سخن کی حرارت اور اُن کے پیغام کا خروش نوجوانوں کے خون کی روانی کو تیز کرتا اور انہیں تسخیرِ ذات اور تسخیرِ کائنات دونوں پر آمادہ کرتا رہا۔

اقبال کی شاعری کا پہلا دور فطری طور پر مطالعے اور تیاری کا دور ہے۔ اُن کی جوانی کی شاعری کے بارے میں شیخ عبدالقادر ''بانگِ درا'' کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

> ''طبیعت زوروں پر تھی۔ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی۔ ایک ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے۔ اُن کے دوست اور بعض طالب علم جو قریب ہوتے' پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دُھن میں کہتے جاتے۔ میں نے اُس ابتدائی زمانے میں انہیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں

دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ اُبلتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً اُن پر طاری ہو جاتی تھی۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ یہ عجیب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے اشعار اس طرح زبان سے نکلیں' اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظے میں محفوظ ہوتے ہیں جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے اور درمیان میں وہ خود انہیں قلم بند بھی نہیں کرتے۔ مجھے بہت سے شعرا کی ہم نشینی کا موقع ملا ہے اور بعض کو میں نے شعر کہتے بھی دیکھا اور سنا ہے' مگر یہ رنگ کسی اور میں نظر نہیں آیا۔ اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بایں ہمہ موزونیٔ طبع' وہ حسبِ فرمائش شعر کہنے سے قاصر ہے۔ جب طبیعت خود مائلِ نظم ہو تو جتنے شعر چاہے کہہ دے' مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع پر حسبِ فرمائش وہ کچھ لکھ سکے' یہ قریب قریب ناممکن ہے۔"

اقبال کی شاعری کے پہلے دور میں وہ سوز اور وہ سیمابی کیفیت موجود ضرور ہے' جسے اُن کے نظامِ سخن کی اوّلین خصوصیت کہنا چاہئے اور جو آگے چل کر اُن کی فکری اور الہامی شاعری پر سر بہ سر چھا گئی' لیکن ابھی اُس نے وہ تلاطم انگیز اور آفاق گیر رنگ اختیار نہیں کیا تھا جو شعرِ اقبال کے دوسرے اور تیسرے دور سے نسبت رکھتا ہے۔ اقبال کے عہدِ شباب کا شعر خودنگری اور خودشناسی کی ایک لطیف وجمیل کیفیت سے سرشار ہے اور جب شاعر اس کیفیت سے ذرا چونکتا ہے تو وہ اپنے گرد وپیش پر بھی ایک نظر ڈال لیتا ہے' لیکن اُس کے پاس اپنے مطالعۂ نفسی کے اظہار اور ایک دلِ دردمند کی پکار کے سوا اور کوئی پیغام نہیں ہے۔ نوجوان شاعر اپنے نوجوان ہم عصروں کو کوئی پیغام دینے سے فطری طور پر ہچکچاتا ہے اور یہ اُس کی حقیقت پسندی اور عظمت کا ایک قطعی ثبوت ہے۔

ابھی تو نوجوان شاعر خود اپنی ذات کے تشخص میں مصروف ہے۔ ابھی تو وہ اپنی ذات سے مخاطب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب نوجوان اقبال خود اپنی ذات کی شناخت میں منہمک تھا تو اس کی اپنی زندگی کی کیا کیفیت تھی؟ اُس کی شخصیت اور فکر کی تعمیر کس انداز میں ہو رہی تھی؟ وہ اپنے بارے میں کیا سوچتا تھا؟ ان سوالوں کے جواب ہم خود اقبال کے اشعار میں ڈھونڈتے ہیں۔۔

حسن ہو کیا خود نما' جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب' جو محفل ہی نہ ہو
ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

(صدائے درد)

منزل کا اشتیاق ہے' گم کردہ راہ ہوں
اے شمع! میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں
میں حسن ہوں کہ سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

(شمع)

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا' جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں' دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر' یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں' عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے' کانٹا نکل گیا ہو
پھولوں کو آئے جس دم' شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو' نالہ مری دعا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

(ایک آرزو)

جوانی کی شاعری میں اقبال حالاتِ حاضرہ' اہلِ ہند کی غلامی اور فرنگیوں کے سامراجی حربوں پر بھی کڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

اقبال کے عہد شباب کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت خودنگری اور خودشناسی ہے' البتہ یہ شاعری اس طوفان کے ابتدائی خروش اور اولین بے تابیوں کا ایک ہلکا سا اظہار ہے جو شروع دن سے اس کے قلب وجگر میں پرورش پا رہی تھیں۔ نوجوان اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں کی رہنمائی کی کوشش نہیں کرتا' لیکن لاشعوری طور پر اس کا مخاطب نوجوان ہی ہے۔

سن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اُس کو جو کچھ ہو رہا ہے' ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے' اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں
ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
جلاتا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا
مگر غنچوں کی صورت میں دلِ دردآشنا پیدا
چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا
مجھے اے ہم نشیں! رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا
دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

(تصویرِ درد)

"ترانۂ ہندی" بھی عہدِ شباب کی شاعری کی تخلیق ہے۔ یہ ترانہ حصولِ آزادی کے بعد بھارت کی حکومت نے سرکاری ترانے کے طور پر منظور کر لیا ہے۔۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی' یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا' آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم' وطن ہے ہندوستاں ہمارا
اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

جیسا کہ اوپر بیان ہوا' اقبال کے عہدِ شباب کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت خودنگری اور خودشناسی ہے' البتہ یہ شاعری اس طوفان کے ابتدائی خروش اور اولین بے تابیوں کا ایک ہلکا سا اظہار ہے جو شروع دن سے اس کے قلب وجگر میں پرورش پا رہی تھیں۔ نوجوان اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں کی رہنمائی کی کوشش نہیں کرتا' لیکن لاشعوری طور پر اس کا مخاطب نوجوان ہی ہے۔ تاہم اقبال کھلم کھلا نوجوان سے گفتگو کرتا' بلکہ اپنے پردۂ دل کا

ایک کونا اٹھا کر دعوتِ نظارہ دے دیتا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی بے حد دلچسپ ہے کہ زندگی کی اس منزل پر خود اس کے اپنے نفس کی کیا کیفیت تھی' اور اُس کی شخصیت اور فکر کی تعمیر کس انداز سے جاری تھی! اس کا جواب اقبال نے اپنی بہت ہی سادہ نظم '' زہد اور رندی'' میں نہایت لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں درحقیقت اقبال نے اپنا تجزیۂ نفس کیا ہے' جیسے وہ خود آئینے کے روبرو ہوں۔ پوری نظم ملاحظہ ہو:

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی

شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا
کرتے تھے ادب اُن کا اعالی و اوانی

کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت
جس طرح کہ الفاظ میں مضمر ہوں معانی

لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی
تھی تہ میں کہیں دُردِ خیالِ ہمہ دانی

کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی

مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی

حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کہ ہے قمریٔ شمشادِ معانی

پابندیٔ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی

ہے اس کی طبیعت میں تشیّع بھی ذرا سا
تفضیلِ علیؓ ہم نے سنی اس کی زبانی

سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل
مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی

کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی

گانا جو ہے شب کو' تو سحر کو ہے تلاوت
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی

لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی

مجموعۂ اضداد ہے' اقبال نہیں ہے
دل دفترِ حکمت ہے' طبیعت خفقانی

رندی سے بھی آگاہ' شریعت سے بھی واقف
پوچھو جو تصوف کی' تو منصور کا ثانی

اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہو گا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے
تادیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی

اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی ہے سب میں
میں نے بھی سنی' اپنے احبا کی زبانی

اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی

فرمایا' شکایت وہ محبت کے سبب تھی
تھا فرض مرا' راہ شریعت کی دکھانی

میں نے یہ کہا' کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا زرہِ قربِ مکانی

خم ہے سرِ تسلیم مرا آپ کے آگے
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی

گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت
پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت سے شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی

مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں' واللہ نہیں ہے

بظاہر یہ ایک لطیف اور شگفتہ مکالمہ ہے' لیکن غور کیجئے تو اس کے ذریعے سے نوجوان شاعر نے اپنے ہم عصر نوجوانوں کو نہ صرف اپنی شخصیت و سیرت کی تعمیر کا ایک ہلکا سا منظر دکھایا ہے' بلکہ اس آزاد خیالی' روشن خیالی اور کشادہ دلی کا ایک واضح تصور بھی اُن کے سامنے رکھ دیا ہے جو اعلیٰ انسانی اقدار کے خلاصے اور جوہر کا دوسرا نام ہے۔

نوجوان اقبال جب اس جوہرِ طبیعت اور اس اندازِ تربیت سے آراستہ ہو کر **1905**ء میں تکمیل تعلیم کے لئے یورپ گیا تو اُسے مغرب میں اپنی فکر کو جلا دینے اور اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرنے کے بے شمار مواقع میسر آئے۔ ان کا ایک حیرت انگیز اثر اس کی طبیعت پر یہ ہوا کہ وہ یورپی ممالک کی جارحانہ وطن پرستی سے بے زار ہو گیا اور عالمِ اسلام کی وحدت کا تصور اپنی پوری شدت سے اُس کے ذہن پر چھا گیا اور اسے یقینِ کامل ہو گیا کہ ہندی مسلمان بلکہ مسلمانانِ عالم کی آزادی و ترقی کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ پھر سے خالص اسلامی شعائر و اقدار کو زندہ کریں اور مذہب کے رسوم و ظواہر سے نہیں بلکہ روحِ اسلام سے زندگی کی انفرادی فلاح اور اجتماعی کامیابی کے وہ اصول کشید کریں جن کی صداقت پر خود گردشِ زمانہ نے بار بار اپنی مہر ثبت کی ہے۔

چنانچہ یورپ کے دورانِ قیام اقبال کے جن افکار و خیالات نے شاعری کا جامہ پہنا' وہ اکثر و بیشتر اسی تاثیر کے حامل ہیں۔ پنجاب کے بابائے اردو یعنی شیخ عبدالقادر بھی انہی دنوں انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم کے لئے مقیم تھے' مگر وہ اقبال سے ایک سال پہلے ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ اُن کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد اقبال نے انہیں ایک منظوم مراسلہ لکھا جو '' بانگِ درا'' میں شامل ہے۔ بظاہر یہ مراسلہ ایک دوست کا خط ہے مگر درحقیقت اُس دردِ پنہاں کا طوفان ہے جو اُن دنوں شاعر کے دلِ دردمند میں کروٹیں لے رہا تھا۔ اقبال فرماتے ہیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں

اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر اُن کو
تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں

رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

دیکھ! یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگرِ شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں

شمع کی طرح جئیں' بزم گہِ عالم میں
خود جلیں' دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

ہندوستان سے بڑھ کر اب ملتِ اسلامیہ کے ایک حساس' نوجوان شاعر کے سینے میں جس قسم کے جذبات تلاطم برپا کر رہے تھے' یہ نظم لطیف ان کی ہلکی سی آئینہ داری کرتی ہے۔ لیکن یہاں بھی اقبال نے خودنگری اور خودشناسی سے صرف ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور

ملت بیضا

کشمیری خاندان کا کوئی شخص کسی دوسرے خاندان میں شادی کرنا چاہتا تھا اور علامہ اقبال اُسے ایسا کرنے سے منع کر رہے تھے۔ محفل میں ایک نوجوان طالب علم بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اعتراض کرتے ہوئے کہا: "آپ تو ہمیشہ ذات پات کی تمیز مٹانے کی تلقین کرتے رہے ہیں"۔ علامہ نے ہنس کر فرمایا: "یہ بالکل درست ہے۔ اگر یہ صاحب وہاں شادی کریں گے تو ان کی اولاد بھی کالی کلوٹی ہو گی۔ میری خواہش ہے کہ مسلمانوں کے بچے بھی خوبصورت اور سرخ و سفید ہوں' تاکہ ہم مسلمان صحیح معنوں میں "ملت بیضا" بن جائیں۔ (مزاح لفظ "بیضا" میں چھپا ہوا ہے' جس کے ایک معنی "سفید" کے ہیں)

مسلمانانِ عالم کی آزادی و ترقی کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ پھر سے خالص اسلامی شعائر و اقدار کو زندہ کریں اور مذہب کے رسوم و ظواہر سے نہیں بلکہ روحِ اسلام سے زندگی کی انفرادی فلاح اور اجتماعی کامیابی کے وہ اصول کشید کریں جن کی صداقت پر خود گردشِ زمانہ نے بار بار اپنی مہر ثبت کی ہے۔

اپنی بے تابیوں میں محض ایک رفیقِ دور افتادہ کو شریک کیا ہے۔ اپنے ہم عصر نو جوانوں کو اس نے اب بھی براہ راست کوئی پیغام نہیں دیا' اگر چہ اپنا سینہ چیر کر دکھانے سے ایک خاموش دعوتِ ہم نفسی ضرور نمایاں ہے۔

ایک طرف اقبال اپنے رفیقِ دور افتادہ کو اٹھنے اور بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کرنے کی دعوت دے رہے ہیں تو دوسری طرف اہلِ مغرب کو ان کی تہذیب کی خامیوں کے باعث براہ راست چیلنج بھی دے رہے ہیں۔ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو' وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہو گا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری' نفس مرا شعلہ بار ہو گا

(مارچ 1907ء)

پھر اقبال کی شاعری کا دوسرا دور آیا جب اقبال نے پختہ سالی کی منزل میں قدم رکھا اور وہ روایتی حق حاصل کیا جس کی رو سے شاعر یا فلسفی اپنے خیالات و جذبات براہ راست اپنے مخاطبین تک پہنچا سکتا ہے۔ اقبال اس بارے میں بہت وضع دار تھے۔ انہوں نے اس حق کا استعمال اس وقت تک نہیں کیا جب تک وہ نو جوانی کے دائرے سے نکل کر بیچ پختہ سالی کی منزل میں داخل نہیں ہو گئے۔ یہاں بھی ان کے مخاطبین محض نو جوان تھے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے ہر جگہ براہ راست نو جوان کا نام لے کر اُس سے خطاب نہیں کیا' لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' ان کے موضوعات میں سے کوئی موضوع ایسا نہیں جس کا تعلق نو جوان' جواں مرد' مردِ جواں ہمت اور اس کے عمل و کردار سے نہ ہو۔

اپنی معروف نظم "خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں اقبال نے ایک منفیانہ رنگ اختیار کیا ہے۔ وہ یہاں جوانانِ اسلام کی موجودہ زبوں حالی کا تلخ جائزہ لے کر خاموش ہو گئے ہیں۔ ابھی اقبال نے مسلم نو جوان کو صرف نادم و شرمسار کیا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گلے سے نہیں لگایا۔ ابھی اس گم کردہ منزل کی طرف اشارہ کیا ہے جسے از سرِ نو حاصل کرنا اس کے لئے مقدر ہو چکا تھا' مگر ہمیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ شاید یہ احساسِ ندامت اقبال کے مخاطب نو جوان کے لئے ایسا ہی ضروری تھا جیسا اُس کے بعد پیدا ہونے والا جذبۂ یقین۔ فرماتے ہیں۔ ؎

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تُو نے؟
وہ کیا گردوں تھا' تُو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں' خلاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا
سمانَ الفقری فخری کا رہا شانِ امارت میں
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تُو گفتار وہ کردار' تُو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اِک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلّم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی' کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

اقبال کی شاعری کا تیسرا دور الہامی شاعری کا دور ہے۔ اس دور میں اقبال پر یہ منکشف ہو چکا تھا کہ اُس کے وطن کے نو جوانوں پر عنقریب نیابتِ الٰہی کی ذمہ داریاں عائد ہونے والی ہیں۔ اپنے کلام میں وہ بار بار اس آنے والی عظمت کی طرف اشارہ کرتے

اقبال نے اپنے تینوں تخلیقی ادوار کے دوران پوری شاعری میں تین بنیادی نظریات دیئے ہیں یعنی خودی' فقر اور عشق۔ یہ تین باطنی اوصاف ہیں۔ جس شخص میں یہ تینوں اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہوں' وہ اقبال کی زبان میں "مومن" ہے اور اس کی تشبیہہ شاہین یا شاہباز۔

ہیں۔ خصوصاً اُن کی لازوال نظم "طلوعِ اسلام" جس کا نام ہی پیغمبرانہ بشارت رکھتا ہے' اس ضمن میں بہترین مثال ہے۔ یہ نظم اُن نظموں کی تمہید کہی جا سکتی ہے جن میں نو جوانوں کو براہ راست مخاطب کیا گیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔ ؎

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو' زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں' وہ کارواں تُو ہے
مکاں فانی' مکیں آنی' ازل تیرا' ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تُو' جاوداں تُو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے' معمارِ جہاں تُو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تُو ہے
جہانِ آب و گِل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی' وہ ارمغاں تُو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تُو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا' عدالت کا' شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبال نے اپنے تینوں تخلیقی ادوار کے دوران پوری شاعری میں تین بنیادی نظریات دیئے ہیں یعنی خودی' فقر اور عشق۔ یہ تین باطنی اوصاف ہیں۔ جس شخص میں یہ تینوں

اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہوں' وہ اقبال کی زبان میں ''مومن'' ہے اوراس کی تشبیہہ شاہین یا شاہباز۔ان تین اعلیٰ ،تعمیری اور مثبت اخلاقی اوصاف کے حصول میں عصر حاضر میں تین بڑی رکاوٹیں ہیں' جن کا ذکر اقبال بڑی درمندی سے کرتے ہیں۔ اول سچے مذہب سے دوری اور کفر والحاد اور لادینیت اختیار کرنا' دوم سچے علم سے دوری اور جدید تعلیم کے مضر اثرات کا پھیلاؤ' سوم سچی تہذیب سے دوری اور مغربی تہذیب اختیار کرنے کے مضر اثرات۔ ان شعبوں میں نوجوانوں کو عمل و کردار کی تلقین کے ساتھ ساتھ اقبال نے دخترانِ ملت اور پھر نونہالان کو بھی اُن کے ذہن و مزاج کے مطابق اپنے پیامِ خوش کلام سے نوازا ہے۔نوجوانوں کو اسلامی نشاۃ ثانیہ اوراس سے منسلک ''اتحاد عالم اسلامی'' کی اہمیت وضرورت کے بارے میں بھی خطاب کیا ہے۔ اپنے فرزند جاوید اقبال کو مخاطب کر کے گویا پوری ملت اسلامیہ کے فرزندوں سے خطاب کیا گیا ہے۔

آئندہ ابواب میں انہی موضوعات وعنوانات کے تحت کلام اقبال سے ایسے اشعار کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے جو نوجوانوں کے نام پیام کی حیثیت بھی رکھتے ہوں اور اُن سے براہ راست ''مخاطبت'' کا پہلو بھی رکھتے ہوں۔ گویا ان موضوعات کی نسبت سے آئندہ ابواب کے عنوان یہ ہوں گے:

الف) نوجوان کے مثبت باطنی اوصاف:

1) خودی' ایمان' یقین
2) فقر' غیرت
3) عشق —— عشقِ قرآن' عشقِ رسولؐ
4) مومن
5) شاہین

ب) نوجوان کے منفی ظاہری اوصاف جن پر قابو پانے کی ضرورت ہے:

5) سچے مذہب سے دوری —— کفر والحاد اور لادینیت کا فروغ
6) سچے علم سے دوری — جدید تعلیم کے مضر اثرات
7) سچی تہذیب سے دوری' مغربی تہذیب کے مضر اثرات
8) دخترانِ ملت کے نام
9) نونہالانِ ملت سے خطاب
10) اسلامی نشاۃ ثانیہ —— عالم اسلام کا اتحاد
11) پیام بذریعہ جاوید اقبال
12) پیام منشور

خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ (حدیث)

ترجمہ: تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے

شعبہ سمع و بصر کی تیار کردہ سی ڈیز

1۔ اسلامی انقلاب کا طریق کار سیرت النبی کی روشنی میں
☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
☆ چھ گھنٹے پر محیط آٹھ لیکچرز کی ویڈیو
☆ Real Media Format میں
New

2۔ بیان القرآن
☆ مدرس: ڈاکٹر اسرار احمد
☆ قرآن مجید کا ترجمہ اور مختصر تشریح دو CDs میں
☆ MP3 FORMAT میں

3۔ خطابات جمعہ (والیم 1تا4)
☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
☆ ۱۹۹۸ سے لیکر آج تک 160 خطابات جمعہ کا مجموعہ 4 CD's میں جس میں اہم دینی موضوعات اور حالات حاضرہ پر تبصرہ زیر بحث ہے
☆ MP3 FORMAT میں

4۔ الھدیٰ
☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
☆ قرآن حکیم کے منتخب نصاب پر مشتمل دین کے جامع تصور سے آگاہی اور دینی تقاضوں کا فہم حاصل کرنے کا مؤثر قرآنی نصاب
☆ MP3 FORMAT میں 44 سلسلہ وار دروس

5۔ اسلام اور خواتین
☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
☆ اہم معاشرتی موضوعات کے بارے میں قرآن وسنت کی راہنمائی پر مشتمل تقاریر جس میں اسلام میں عورت کا مقام، اسلام میں شرعِ حجاب کے احکام، جہاد میں خواتین کا کردار، قرآن اور پردہ جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔
☆ MP3 FORMAT میں

6۔ Basic Themes of Al Quran
English
☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
☆ ایمان، شرک، جہاد، نفاق اور خلافت کے موضوعات پر تفصیلی لیکچرز بزبانِ انگریزی
☆ MP3 FORMAT میں

7۔ پاکستان فیصلہ کن دوراہے پر
☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
☆ حالاتِ حاضرہ اور ہمارے لئے کرنے کا اصل کام کے سلسلہ میں ایک فکر انگیز خطاب

8۔ AL-HUDA
English
☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
☆ قرآن مجید کے منتخب نصاب پر مشتمل سلسلہ وار تقاریر
☆ MP3 FORMAT میں 2 CDs پر مشتمل

9۔ انٹرنیشنل خلافت کانفرنس (VIDEO)
☆ گذشتہ سال لاہور میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل خلافت کانفرنس کی کاروائی پر مشتمل ویڈیو (تقریباً 9 گھنٹے)
☆ Real Media Format میں

10۔ تلاوت قرآن
☆ تاریخ اسلام کے دو مصری قراء کی آواز میں تلاوت قرآن قاری محمد صدیق المنشاوری اور قاری محمود خلیل الحصری
☆ MP3 FORMAT میں

11۔ بیان القرآن -VCD
☆ 1998 میں ریکارڈ شدہ دورہ ترجمہ قرآن کی ویڈیو۔
☆ 108 VCD پر مشتمل
☆ بہترین ویڈیو اور ساؤنڈ کوالٹی کے ساتھ
☆ قرآن مجید کا Text بھی شامل ہے
☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد

یہ پروگرام ARY-DIGITAL پر گذشتہ دو سال سے روزانہ دکھایا جا رہا ہے۔

VISIT US AT www.tanzeem.org
One of the biggest Islamic Websites

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قرآن اکیڈمی ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن، لاہور۔

Tel: (92-42) 5869501-03 Fax: (92-42) 5834000 E-mail: info@tanzeem.org Web: www.tanzeem.org

خودی

اقبالیات کے ایک بڑے مفسر اور شارح ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اپنی تصنیف ''حکمت اقبال'' میں کلامِ اقبال کی روشنی میں اقبال کے فلسفۂ خودی کی مفصل اور منظم تشریح کی ہے۔ خودی کی تعریف بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ''اقبال کی حکمت میں خودی سے مراد وہ شعور ہے جو خود شناس اور خود آ گاہ ہو اور اپنی ذات اور اپنے مقاصد کا احساس یا شعور رکھتا ہو' لیکن یہاں شعور کا مطلب ہوش یا تمیز نہیں' بلکہ وہ چیز ہے جس کا خاصہ ہوش یا تمیز رکھنا ہے یا جس کی وجہ سے ایک انسان تمیز یا ہوش رکھتا ہے۔ انسان میں یہی چیز ہے جو خود شناس یا خود آ گاہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ''میں'' کہتی ہے' اس لئے اقبال اس کو ''انا'' یا ''ایغو'' یا ''من'' بھی کہتا ہے اور پھر یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے انسان زندہ ہے' اور جب مرتا ہے تو یہی وہ چیز ہے جو اس کے جسم سے رخصت ہو جاتی ہے' اس لئے اقبال اس کے لئے ''روح'' اور ''جان'' کے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے اور اس کو ''زندگی'' اور ''حیات'' کے ناموں سے بھی تعبیر کرتا ہے۔

عقل مدت سے ہے اس پیچاک میں الجھی ہوئی
روح کس جوہر سے' خاک تیرہ کس جوہر سے ہے

زندگی بغیر شعور کے نہیں ہوتی' لہٰذا ان معنوں میں کہ شعور زندگی ہے' ایک خاص سطح کا شعور حیوان میں بھی موجود ہے' لیکن حیوان کا شعور آزاد نہیں' بلکہ قدرت کی پیدا کی ہوئی ناقابل تغیر جبلتوں کے ماتحت کام کرتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کا شعور جبلتوں سے آزاد ہو کر اور ان کی مخالفت میں بھی عمل کرتا ہے' اس لئے کہ وہ خود شناس اور خود آ گاہ ہے' اور اپنے مقاصد کو جانتا ہے۔ حیوان اپنے شعور کی وجہ سے فقط سوچتا' جانتا اور محسوس کرتا ہے' لیکن انسان اپنے شعور کی وجہ سے نہ صرف جانتا' سوچتا اور محسوس کرتا ہے' بلکہ جب وہ ایسا کرتا ہے تو وہ جانتا بھی ہے کہ وہ جانتا' سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ اس لئے ہم انسان کے شعور کو خود شناس اور خود آ گاہ کہتے ہیں۔ اسے شعور نہیں بلکہ خود شناسی' خود شعوری یا خود آ گاہی کہنا چاہئے۔ اقبال اسی کو ''خودی'' کہتا ہے۔

خود آ گاہی

خود آ گاہی خودی کی ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے کائنات برپا ہے اور انسان کی ساری تگ و دو اور جدوجہد اسی خاصیت کی وجہ سے ہے۔ اسی کی وجہ سے خودی اپنے آپ کو آنکھوں کے بغیر دیکھتی ہے' کانوں کے بغیر سنتی ہے' بلکہ اپنے آپ کو کسی حس کی مدد کے بغیر براہ راست پوری طرح سے جانتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہوں' کیونکہ میں سوچ رہا ہوں' جان رہا ہوں اور خوشی یا غم محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن میری کوئی حس مجھے اپنے آپ کو جاننے میں مدد نہیں دے رہی۔ اگرچہ میں اپنی خودی کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا' لیکن اس کے باوجود ان آنکھوں کے بغیر اس طرح سے دیکھ رہا ہوں کہ میرے لئے اپنے آپ کا علم ان چیزوں کے علم سے بدرجہا زیادہ یقینی ہے' جن کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ بلکہ میں جن چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جانتا ہوں' ان کا جاننا میرے لئے اسی وجہ سے ممکن ہے کہ میں اپنی خودی کو جانتا ہوں' کیونکہ ان کا علم وہی ہے جس کو میری خودی جانتی ہے اور میری خودی سے باہر ان کا کوئی علم نہیں' لہٰذا اگر میں اپنی خودی کو نہ جانوں تو دنیا کی کسی چیز کو دیکھنے کے باوجود نہیں جان سکتا۔ اگر دنیا بھر میں کسی چیز کا یقینی علم ہمیں حاصل ہے تو وہ فقط اپنی خودی کا علم ہے۔ ہم اپنی خودی کے علم سے ہی اپنے دوسرے غیر خودی کے علم کو پرکھتے ہیں۔

خودی کا وجود فریب یا وہم نہیں

خارج کی دنیا کے متعلق ہمارا علم قیاسی ہے اور ہمارا قیاس حواس پر مبنی ہوتا ہے۔ حواس کے تاثرات کے بدلنے سے خواہ اس کا کوئی سبب خارج میں ہو یا نہ ہو' ہمارا علم بدل جاتا ہے' اس لئے کوئی شخص کائنات کے متعلق تو کہہ سکتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں' اور زمین و آسمان در حقیقت موجود نہیں ہیں یا ان کی حیثیت ایک ایسے خواب یا وہم سے زیادہ نہیں جو خالق کائنات کی ہستی کے لئے ایک پردے کا کام دے رہا ہے' لیکن کوئی شخص خودی کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ ایک وہم ہے۔ خودی کا وجود محسوس دنیا' خارجی دنیا یا مادی دنیا کی چیز نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے حواس اور ہمارے قیاسات اس کو جاننے کا وسیلہ نہیں بنتے۔

زمان و مکاں سے بے نیازی

اس کے باوجود کہ خودی انسان کے جسد عنصری میں جاگزیں ہے جو سلسلۂ لیل و نہار کی پابندیوں میں گھرا ہوا ہے' وہ خود زمان و مکاں کی حدود و قیود سے آزاد ہے' کیونکہ وہ اپنے خیال کے ذریعے سے اِدھر ماضی اور مستقبل کی انتہاؤں تک اور اُدھر کائنات کے دور دراز گوشوں تک جہاں روشنی بھی کروڑوں برس میں آتی ہے آنِ واحد میں جا پہنچتی ہے۔

چونکہ ہم خودی کو کسی حالت میں بھی نہ آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان ہاتھوں سے چھو سکتے ہیں اور غیر کی خودی اپنی خودی نہیں ہوتی کہ ہم حواس کی مدد کے بغیر براہ راست اسے دیکھ سکیں۔ ہم غیر کی خودی کا علم خواہ وہ خودی خدا کی ہو یا انسان کی' فقط اس کے مظاہر اور اثرات اور اعمال اور افعال کے مطالعے ہی سے حاصل کر سکتے ہیں۔

خودی ایک نورانی طاقت ہے

خودی ایک نور ہے' لیکن مادی روشنیوں میں سے کوئی روشنی ایسی نہیں جو اس کی مماثل ہو اور پھر خودی ایک قوت ہے لیکن مادی قوتوں میں سے کوئی قوت ایسی نہیں جس کے ساتھ اس کو مشابہت دی جا سکے۔ یہی وہ نورانی طاقت ہے جس کا انسان میں اور دنیا کی ہر چیز میں ظہور ہے۔ یہی زندگی ہے۔

مشکلات پر غالب آنے کی خواہش

لفظ خودی کی اس تشریح سے ظاہر ہے کہ اقبال نے اس لفظ کو استعمال کر کے انگریزی لفظ Self کا فارسی یا اردو ترجمہ کیا ہے' جو مدت سے فلسفہ کی ایک اصطلاح کے طور پر

استعمال ہو رہا ہے' لیکن افسوس ہے کہ خودی کی اس سادہ اور معروف فلسفیانہ اصطلاح کو سمجھنے میں بالعموم اقبال کے ایسے معتقدین کو بھی دقت آتی ہے جو اس کے بہت قریب رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خودی کا لفظ اب تک فارسی اور اردو میں ایک اور معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے' یعنی خود پرستی' خود مختاری' خودسری' خودرائی' خود پسندی' خودغرضی' غرور' نخوت اور تکبر کے معنوں میں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اقبال نے بھی اپنی قوم کی موجودہ حالت کے پیش نظر خودی کی گوناگوں فطری صفات میں سے اس صفت پر خاص زور دیا ہے جس کا ایک پہلو خودنمائی ہے یا ذوقِ تفوق ہے۔

اس صفت کی رو سے خودی ایک مقصد کا تصور کرتی ہے۔ پھر اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی پوری قوت سعی و عمل صرف کرتی ہے۔ اس عمل سے اسے اپنے مقصد میں حائل ہونے والی مخالف قوتوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کا یعنی اپنی قوتوں کا اظہار کرتی ہے اور اس خود اظہاری سے اسے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ خودی کی فلسفیانہ اصطلاح روزمرہ کی زبان میں استعمال ہونے والے لفظ خودی کے ساتھ معنی کا اشتراک رکھتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کے نزدیک جذبۂ خودنمائی یا ذوقِ استیلاء کے جائز اور ناجائز استعمال میں کوئی خاص خوبی ہے' اور اقبال کی تعلیم یہی ہے کہ جس طرح سے ممکن ہو' اس جذبے کا اظہار کیا جائے۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔

خودی ایک مقصد کا تصور کرتی ہے۔ پھر اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی پوری قوت سعی و عمل صرف کرتی ہے۔ اس عمل سے اسے اپنے مقصد میں حائل ہونے والی مخالف قوتوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کا یعنی اپنی قوتوں کا اظہار کرتی ہے اور اس خود اظہاری سے اسے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

یہاں اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے دو گزارشات ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ خودی کے مقاصد اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی' صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی۔ جدوجہد یا عمل سے خودی کو مستقل اور مکمل اطمینان اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب اس کا مقصد اس کی فطرت کے مطابق ہو' غلط مقصد کی پیروی سے خودی کو عارضی تسلی ہو تو ہو لیکن آخرکار اسے بے اطمینانی اور ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی جدوجہد آخرکار خود اس کے اندرونی فطری مقصد کو شکست دے دیتی ہے۔ اور دوسری گزارش یہ ہے کہ عمل یا جدوجہد احساسِ مدعا کا لازمی نتیجہ ہے' اور خودی ہر آن کوئی نہ کوئی مدعا (اچھا یا برا' صحیح یا غلط) رکھنے پر مجبور ہے' اور لہٰذا ہر وقت عمل یا جدوجہد کرنے پر بھی مجبور ہے۔ غلط مدعا غلط عمل پیدا کرتا ہے اور صحیح مدعا صحیح عمل پیدا کرتا ہے۔ اقبال صرف اسی عمل کی تلقین کرتا ہے جو خودی کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہو' اور لہٰذا صحیح ہو۔ اس کے نزدیک صحیح مدعا اور لہٰذا صحیح عمل فقط ''مردِ مومن'' کا امتیاز ہے۔ گویا اقبال نے جو عملی جدوجہد اور خودنمائی پر زور دیا ہے' اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد یا مدعا کو درست کریں۔ اسی کو وہ یقینِ محکم یا ایمان کہتا ہے۔ اگر مدعا نقائص سے پاک اور شکوک و شبہات سے آزاد ہو کر درست ہو جائے تو وہ ایک طاقتور عزم یا ارادۂ عمل بن جاتا ہے۔

اقبال کی وضاحت

اقبال نے خود اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ خودی سے اس کی مراد تکبر یا غرور نہیں۔ ''اسرارِ خودی'' کے دیباچے میں اس نے لکھا ہے:

''ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی مغرور استعمال نہیں کیا گیا' جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے''۔

قاضی نذیر احمد کے نام اپنے مکتوب میں اقبال نے لکھا ہے:

''اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی دونوں کا موضوع یہی مسئلۂ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔ اگر ان دونوں میں یا میری کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے' جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا غرور لیا گیا ہو یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجئے''۔

نیٹشے پر اقبال کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نوٹ ''اقبال اکادمی'' کے پاس محفوظ ہے۔ اس نوٹ میں لفظ خودی کی تشریح کرتے ہوئے اقبال نے لکھا ہے:

''لفظ خودی کو بڑی مشکل سے اور بادلِ ناخواستہ چنا گیا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کے اندر بہت سی خامیاں ہیں۔ اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اسے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہمیشہ برے معنوں میں ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ دوسرے الفاظ بھی جو ''میں'' کی مابعد الطبیعیاتی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں' اتنے ہی ناموزوں ہیں' مثلاً: انا' شخص' نفس' انانیت۔

ضرورت دراصل اس بات کی ہے کہ ''من'' یا ''ایغو'' کے لئے ایک ایسا لفظ لایا جائے جو بے رنگ ہو اور کسی اخلاقی مفہوم کے بغیر ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے' فارسی یا اردو میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں۔ فارسی لفظ ''من'' بھی اتنا ہی ناموزوں ہے۔ تاہم شعر کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے سمجھا کہ لفظ ''خودی'' سب سے زیادہ موزوں ہے۔ فارسی زبان میں کسی قدر اس بات کی شہادت بھی موجود ہے کہ لفظ خودی ایغو کے سادہ مفہوم یعنی ''من'' کے بے رنگ معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ گویا مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر سے خودی کا لفظ ''من'' کے اس ناقابل بیان احساس کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو ہر فردِ انسانی کی بے مثل انفرادیت کی بنیاد ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعیاتی طور پر اس لفظ کا کوئی مفہوم ایسے لوگوں کے لئے نہیں جو اس کے اخلاقی مفہوم سے نجات نہیں پا سکتے۔ میں ''زبورِ عجم'' میں پہلے کہہ چکا ہوں ؎

گرفتم ایں کہ شرابِ خودی بسے تلخ است
بدرد خویش نگر' زہر ما بدرمان کش

(خودی کی شراب بے شک تلخ ہے' لیکن اپنے مرض پر نگاہ رکھو اور اپنی صحت کی خاطر میرے زہر کو پی لو۔)

جب میں نفیٔ خودی کی مذمت کرتا ہوں تو مطلب اس سے اخلاقی معنوں میں ایثار یا نفس کشی کی مذمت نہیں ہوتا۔ نفیٔ خودی کی مذمت سے میں ایسے افعال کی مذمت کرتا ہوں' جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ''میں'' کو ایک مابعد الطبیعیاتی قوت کی حیثیت سے مٹا دیا جائے' کیونکہ اسے مٹانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اجزا بکھر جائیں۔ وہ حیات بعد ممات کے قابل نہ رہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' اسلامی تصوف کا نصب العین خودی کو مٹانا نہیں۔ اسلامی تصوف میں فنا سے مراد انسانی ایغو کو مٹانا نہیں بلکہ اس کو مکمل طور پر خدا کی ذات کے سپرد کر دینا ہے۔ اسلامی تصوف کا نصب العین ایک ایسا مقام ہے جو فنا کے مقام سے بھی آگے ہے' یعنی مقامِ بقا' جو میرے نقطۂ نظر سے اثباتِ خودی کا بلندترین مقام ہے۔ جب میں کہتا ہوں ''لعل کی طرح سخت ہو جاؤ'' تو میری مراد نیٹشے کی طرح یہ نہیں ہوتی کہ بے رحم اور بے درد ہو جاؤ' بلکہ یہ ہوتی ہے کہ خودی کے عناصر کو مجتمع کرو' تا کہ وہ بعد از مرگ زندہ رہنے کے لئے فنا کا مقابلہ کر سکے۔

اخلاقی نقطۂ نظر سے لفظ خودی (جیسا کہ اسے میں نے استعمال کیا ہے) کا مطلب ہے خود اعتمادی' خودداری' اپنی ذات پر بھروسہ' حفاظتِ ذات' بلکہ اپنے آپ کو غالب کرنے کی کوشش' جیسا کہ ایسا کرنا زندگی کے مقاصد کے لئے اور صداقت' انصاف اور فرض کے تقاضوں کو پورا کرنے کی قوت کے لئے ضروری ہو۔ اس قسم کا کردار میرے خیال میں اخلاقی ہے' کیونکہ وہ خودی کو اپنے قویٰ کے مجتمع کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس طرح تحلیل اور انتشار کی قوتوں کے خلاف خودی کو سخت کر دیتا ہے۔ عملی طور پر مابعد الطبیعیاتی

الغرض دو بڑے حقوق کا علم بردار ہے۔ اول زندہ رہنے کا حق اور دوم آزاد رہنے کا حق' جیسا کہ قانون الٰہی نے مقرر کیا ہے۔"

خودی کی تعریف و تشریح کے بعد اب یہاں کلام اقبال سے خودی کے موضوع پر ایسے اشعار کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے جن کا تعلق نوجوانوں اور ان کی بہبود و ترقی سے ہے۔ پہلے اردو کلام سے اور پھر فارسی کلام سے انتخاب پیش کیا جائے گا۔

تو رازِ کن فکاں ہے' اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا' خدا کا ترجماں ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا' محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی' یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل' اچھل کر بیکراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پُرفشاں ہو جا

خودی میں ڈوب جا غافل' یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

(بانگ درا: طلوع اسلام)

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازۂ صحرا

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تُو سمجھا' نہ میں سمجھا

نگہ پیدا کر اے غافل' تجلی عینِ فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

رقابت علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی
کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں' غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

نہ کر تقلید اے جبرئیل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

(بال جبریل: حکیم سنائی غزنوی کے مزار پر)

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبریل دے تو کہوں

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں

حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں

عجب مزا ہے' مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں

ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں' نہ فکرِ افلاطوں

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

(بال جبریل: حکیم سنائی غزنوی کے مزار پر)

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں
جو ناز ہو بھی' تو بے لذتِ نیاز نہیں

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مُردہ سزاوارِ شاہباز نہیں

ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق
سبب یہ ہے کہ محبت زمانہ ساز نہیں

اک اضطرابِ مسلسل غیاب ہو' کہ حضور!
میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

(بال جبریل: غزل 15)

خودی ہے وہ بحر جس کا کوئی کنارہ نہیں
تُو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

خودی میں ڈوبتے ہیں' پھر ابھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے!
کہ خاکِ زندہ ہے تُو تابعِ ستارہ نہیں

یہیں بہشت بھی ہے' حور و جبریل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیٔ نظارہ نہیں

(بال جبریل: غزل 21)

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

تری زندگی اسی سے' تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی' نہ رہی تو رُوسیاہی

(بال جبریل: غزل 22)

تری نگاہ فرومایہ' ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

خودی میں گم ہے' خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاحِ کار کی راہ

حدیثِ دل کسی درویشِ بے گلیم سے پوچھ
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ!

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک
نہ زندگی' نہ محبت' نہ معرفت' نہ نگاہ

(بال جبریل: غزل 23)

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

(بال جبریل: 24)

یہ بندگی خدائی' وہ بندگی گدائی!
یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی
شاید کسی حرم کا تُو بھی ہے آستانہ

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ' کردار قاہرانہ

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

رازِ حرم سے شاید اقبال باخبر ہے
ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ

(بال جبریل: غزل 32)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے' بتا تیری رضا کیا ہے

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں
نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے' وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

(بال جبریل: غزل 33)

فطرت کو خرد کے روبرو کر
تسخیرِ مقامِ رنگ و بُو کر

تُو اپنی خودی کو کھو چکا ہے
کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا' وہ تُو کر

(بال جبریل: غزل 37)

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

اندھیری شب ہے' جدا اپنے قافلے سے ہے تُو
ترے لئے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

(بال جبریل: غزل 42)

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا
مقامِ رنگ و بُو کا راز پا جا

برنگِ بحر' ساحل آشنا رہ
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا

(بال جبریل: رباعی)

حکیمی نامسلمانی خودی کی
کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی

تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں
غریبی میں نگہبانی خودی کی

(بال جبریل: رباعی)

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک　　من و تُو میں پیدا' من و تُو سے پاک
ازل اس کے پیچھے' ابد سامنے　　نہ حد اس کے پیچھے' نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی　　ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی　　دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں　　پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے　　یہی اس کی تقویم کا راز ہے
کرن چاند میں ہے' شرر سنگ میں　　یہ بے رنگ ہے' ڈوب کر رنگ میں
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے　　نشیب و فراز و پس و پیش سے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر　　ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے
(بال جبریل: ساقی نامہ)

زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگیں　　جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں
بُتانِ شعوب و قبائل کو توڑ　　رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ
یہی دینِ محکم' یہی فتح باب　　کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب
(بال جبریل: پنجاب کے دہقان سے)

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا　　ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے
کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار　　جب تک تُو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے
(بال جبریل: ماہر نفسیات سے)

خودی کا سِرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ　　خودی ہے تیغ' فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے　　صنم کدہ ہے جہاں' لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تُو نے متاعِ غرور کا سودا　　فریبِ سُود و زیاں' لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا' یہ رشتہ و پیوند　　بُتانِ وہم و گماں' لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری　　نہ ہے زماں نہ مکاں' لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند　　بہار ہو کہ خزاں' لا الٰہ الا اللہ
اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں　　مجھے ہے حکمِ اذاں' لا الٰہ الا اللہ
(ضرب کلیم: لا الٰہ الا اللہ)

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود　　مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا
وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود　　کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا
(ضرب کلیم: افرنگ زدہ)

اے پیرِ حرم' رسم و رہِ خانقہی چھوڑ　　مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت　　دے ان کو سبق خود شکنی' خود نگری کا
تُو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے　　مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی　　دارُو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا
کہہ جاتا ہوں زورِ جنوں میں ترے اسرار　　مجھ کو بھی صلہ دے مری آشفتہ سری کا
(ضرب کلیم: اے پیرِ حرم)

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی　　ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے　　وہ عالمِ مجبور ہے' تُو عالمِ آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے　　پنہاں جو صدف میں ہے' وہ دولت ہے خداداد
(ضرب کلیم: اسرارِ پیدا)

نہ میں اعجمی' نہ ہندی' نہ عراقی و حجازی　　کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

ایک آم

علامہ اقبال کو آم کھانے کا بہت شوق تھا' لیکن آخری بیماری کے ایام میں ڈاکٹروں نے انہیں آم کھانے سے منع کر دیا۔ اس پر آپ قدرے پریشان ہو کر کہنے لگے: "مرنا تو برحق ہے۔ پھر آم نہ کھا کر مرنے سے آم کھا کر مرجانا بہتر ہے۔" چنانچہ بڑے اصرار سے حکیم نابینا سے ایک آم روزانہ کھانے کی اجازت حاصل کر لی۔ مولانا عبدالمجید سالک بیان کرتے ہیں کہ انہی دنوں وہ علامہ اقبال سے ملنے کے لئے گئے تو دیکھا کہ میز پر بمبئی کا کوئی ایک سیر وزنی آم رکھا ہے۔ انہیں بدپرہیزی کا طعنہ دیا گیا تو فرمایا: "حکیم صاحب نے روزانہ ایک آم کھانے کی اجازت دے دی ہے' اور یہ آم بہرحال ایک ہی آم تو ہے"۔

تُو مری نظر میں کافر' میں تری نظر میں کافر　　ترا دیں نفس شماری' مرا دیں نفس گدازی!
(ضرب کلیم: غزل)

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود　　کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے　　اس آبجو سے کئے' بحرِ بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے　　جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں　　ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا
ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے　　عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا
(ضرب کلیم: تخلیق)

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود　　حیات کیا ہے؟ اُسی کا سرور و سوز و ثبات
بلند تر مہ و پرویں سے ہے اُسی کا مقام　　اُسی کے نُور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
حریم تیرا' خودی غیر کی! معاذ اللہ　　دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات
یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تُو نہ رہے　　رہا نہ تُو' تو نہ سوزِ خودی نہ سازِ حیات
(ضرب کلیم: تیاتر)

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ　　میں جانتا ہوں' وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے' نہ لندن میں　　فرنگ کی رگِ جاں' پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات　　خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے
(ضرب کلیم: فلسطینی عرب سے)

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی　　مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تُو بدل جائے
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا　　عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے
وہی شراب' وہی ہائے و ہو رہے باقی　　طریقِ ساقی و رسمِ کدو بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری　　مری دعا ہے' تری آرزو بدل جائے!
(ضرب کلیم: محراب گل افغان کے افکار: 3)

رومی بدلے' شامی بدلے' بدلا ہندوستان
تُو بھی اے فرزندِ کہستاں' اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان

او غافل افغان

موسم اچھا' پانی وافر' مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا' وہ کیسا دہقان

اپنی خودی پہچان

او غافل افغان

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا ہے
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں' وہ کیسا طوفان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ
اس بندے کی دہقانی پر سلطانی قربان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

تیری بے علمی نے رکھ لی بے علموں کی لاج
عالم فاضل بیچ رہے ہیں' اپنا دین ایمان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان

(ضرب کلیم: محراب گل افغان کے افکار: 7)

مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں
معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا
ہر سینے میں اک صبح قیامت ہے نمودار
افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا
کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے پیر حرم' تیری مناجات سحر کیا؟
ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا

(ضرب کلیم' محراب گل افغان کے افکار: 13)

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقام حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحان ثبات
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا
ترے فراق میں مضطر ہے موج نیل و فرات
خودی ہے مُردہ تو مانند کاہ پیش نسیم
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات

(ارمغان حجاز: مسعود مرحوم)

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تُو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟

(ارمغان حجاز: رباعی)

کبھی دریا سے مثلِ موج ابھر کر
کبھی دریا کے سینے میں اُتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر
مقام اپنی خودی کا فاش تر کر

(ارمغان حجاز: رباعی)

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں' سکندرانہ جلال
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں
خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال
کہ یہ کتاب ہے' باقی تمام تفسیریں

(ارمغان حجاز: ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کی بیاض)

اقبال کا فارسی کلام اُن کے فلسفۂ خودی سے بھرا پڑا ہے۔ خاص طور پر مثنوی ''اسرار و رموز'' تو فلسفۂ خودی ہی کی تشریح ہے اور اس فلسفے کا خلاصہ انہوں نے اپنی نظم ''بابائے صحرائی کی نصیحت'' میں کر دیا ہے۔ یہ نصیحت نوجوانوں کے نام ہے۔ ''بابائے صحرائی'' کے پردے میں خود علامہ اقبال جلوہ گر ہیں۔ ''اسرار و رموز'' کا منظوم ترجمہ ''ترجمان اسرار'' کے نام سے جسٹس ایس اے رحمٰن نے کیا اور انتہائی دردمندی اور مہارت سے کیا۔ یہاں ''بابائے صحرائی کی نصیحت'' کا یہی ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

بابائے صحرائی کی نصیحت

تُو اے جو پھول کی مانند مٹی سے پھلا پھولا
ہوا بطنِ خودی سے تو ریاضِ دہر میں پیدا
نہ کر ترکِ خودی ہرگز' بقا انجام ہو کر رہ
جو قطرہ ہو کے رہتا ہے تو بحر آشام ہو کر رہ
خودی کے نُور سے ہوتی ہے ہستی تیری تابندہ
خودی محکم اگر کر لے تو ہو جائے تُو پائندہ
یہ سودا فائدے کا ہے' نہ اس سودے سے ہو غافل
یہ وہ دولت ہے جس سے تجھ کو ہو گی خواجگی حاصل
اگر زندہ ہے تُو' کیوں نیستی سے ڈرتا رہتا ہے
ترے قرباں غلط سمجھا ہے تُو جو کچھ بھی سمجھا ہے
حقیقت مجھ پہ روشن ہے کہ سازِ زندگی کیا ہے
ادھر آ میں بتاؤں تجھ کو رازِ زندگی کیا ہے
خود اپنے آپ ہی میں غوطہ زن مثلِ گہر ہونا
اُبھر کر اپنی خلوت گاہ سے آتش نظر ہونا
دبی چنگاریوں کو راکھ کی ڈھیری میں بھڑکانا
جو نظروں کو جلا دے ایسا شعلہ زار بن جانا
چہل سالہ مصیبت کا گھروندا پھونک کر رکھ دے
تو بن کر شعلۂ جوالہ اپنے گرد چکر لے
جو طوفِ غیر ہی کو موت گردانے' وہ زندہ ہے
وجود اپنے کو جو بیت الحرم جانے' وہ زندہ ہے
پروں کو پھڑپھڑا کر تو نکل مٹی کے پھندے سے
پرندوں کی طرح محفوظ ہو گرنے کے خدشے سے
اگر طائر نہیں ہے تو' نہ کر پھر امتحاں اپنا
دہانِ غار پر ہرگز بنا مت آشیاں اپنا
تری خواہش ہے باغِ علم کے سب پھول تو چن لے
پیامِ پیرِ رومی گوشِ دل سے تُو مگر سُن لے
نہیں اُفعی سے کم وہ علم جو بس تن کے کام آئے
ترا ہمدم بنے گا علم اگر وہ دل کو گرمائے
تجھے معلوم ہے یہ داستاں استادِ رومی کی
کہ جس کی درس گہ شہرِ حلب میں علم پرور تھی
پڑی عقلی دلیلوں کی تھی بیڑی اس کے پاؤں پر
پھنسی تھی اس کی کشتی عقل کے گرداب میں آ کر
وہ موسیٰ تھا مگر بیگانہ سینائے محبت سے
نہ اس کو عشق سے مس تھا نہ سودائے محبت سے
تشکک پر کبھی اشراق پر اصرار ہوتا تھا
ہر اک موضوع پر حکمت کے موتی وہ پروتا تھا
وہ سلجھاتا تھا اکثر قولِ مشائین سے عقدے
اجاگر اس کے نورِ فکر سے اسرار تھے سارے
کتابوں کے ذخیروں میں سدا محصور رہتا تھا
نشے میں شرح [illegible] کے چُور رہتا تھا

اشارہ ہو گیا جب پیر تبریزی کو مرشد کا
جلال الدین کے مکتب کا اُس نے رخ کیا سیدھا
کہا یہ شور و غوغا اور یہ قیل و قال کیسے ہیں؟
خدارا یہ قیاس و وہم و استدلال کیسے ہیں؟
کہا یوں مولوی نے ڈانٹ کر: ''خاموش اے ناداں
خردمندوں کی باتوں پر ہنسی تجھ کو نہیں شایاں
پرے ہٹ' دور ہو جا میرے مکتب سے او دیوانے
ترا کیا کام ہے اس سے' تو قیل و قال کیا جانے!
ہماری گفتگو تیری سمجھ کی حد سے باہر ہے
اسی کے نور سے ادراک کا شیشہ منور ہے''
بڑھایا سوزِ شمس ان بے طرح باتوں نے ملا کی
بھڑک اٹھی غضب کی آگ سے تب روح تبریزی
زمیں پر اس کی نظروں نے گرائے برق کے پارے
نمایاں اس کے سوزِ دم سے مٹی میں ہوئے شعلے
جلایا خرمنِ ادراک یکسر دل کی آتش نے
کیا سب فلسفے کا پاک دفتر دل کی آتش نے
وہ ملا عشق کے اعجاز سے واقف نہ تھا اب تک
وہ سازِ عشق کے نغموں سے تھا ناآشنا اب تک
پکار اٹھا: ''یہ شعلہ کس طرح بھڑکا دیا تُو نے
کہ جس سے دفترِ حکمت کو خاکستر کیا تُو نے''
کہا یوں شیخ نے: ''ہے مسلم زنار بستہ تُو
یہ ذوق و حال ہے' خاموش رہ' لے اپنا رستہ تو
ترے فکر و تخیل سے ہمارا حال بالا ہے
جو مِس کو زر کرے وہ کیمیا شعلہ ہمارا ہے
ترے سرمایہ کو ہے برفِ حکمت سے ملا کس بل
فقط اولے ہی برساتا ہے تیرے فکر کا بادل
اُٹھ اپنے ہی خس و خاشاک سے آتش فروزاں کر
تُو اپنی خاک کے ہر ذرہ کو شعلہ بداماں کر
نہ ہو گر سوزِ دل' مسلم نہیں ہے علم میں کامل
یہی ہے معنی اسلام' تُو ہو تارکِ آفل
جو ابراہیمؑ نے پائی رہائی بندِ آفل سے
نہ اس کا بال بیکا کر سکے نمرود کے شعلے
لگن باطل کی ہے تجھ کو' تُو علمِ حق کو بھولا ہے
فقط روٹی کی خاطر نقدِ دیں کو تُو نے بیچا ہے
تو سرگرداں و آوارہ ہوا ہے دُھن میں سرمے کی
نہاں ہے تیری نظروں سے مگر چشمِ سیہ تیری
تمنا کر کہ تجھ کو آبِ حیواں دے دمِ خنجر
تو خواہاں ہو کہ تجھ کو سانپ کے منہ سے ملے کوثر
طلب کر سنگِ اسود تو درِ بُت خانہ سے جا کر
طلب کر مشک کا نافہ سگِ دیوانہ سے جا کر
نہ لیکن ڈھونڈ سوزِ عشق ہرگز علمِ حاضر سے
ملے گا کیفِ حق کا جام کیا اس پختہ کافر سے

مجھے آوارہ رکھا ایک مدت علم کی لَو نے
بنایا محرمِ راز اپنا مجھ کو دانشِ نَو نے
چمن والوں نے میرا امتحاں کر کے مجھے پرکھا
کیا ہمراز مجھ کو تب انہوں نے اس گلستاں کا
نہیں گلشن' حقیقت میں یہ لالہ زار عبرت ہے
گلِ کاغذ کی صورت یہ سرابِ رنگ و نکہت ہے
ہوا ہوں قید سے اس گلستاں کی میں رہا جب سے
بنا ہے آشیانہ شاخِ طوبیٰ پر مرا تب سے
نظر کے واسطے ہے علمِ نو سب سے بڑا پردہ
ہے اس کا بُت پرستی' بُت فروشی' بت گری شیوہ
پڑی ہے پاؤں میں اس کے مظاہر کی کڑی بیڑی
حدودِ حس سے یہ نکلے' نہیں تدبیر کچھ اس کی
گرا یوں راہِ ہستی میں' اسے جینا ہوا دُوبھر
خود اپنے ہی گلے ہی اُس نے آخر رکھ دیا خنجر
نہیں ہے اس کی آتش میں حرارت لالہ کی صورت
بظاہر شعلہ رکھتا ہے' خنک ہے ژالہ کی صورت
رہی ہے آزاد فطرت اس کی سوزِ عشق سے یکسر
جہانِ جستجو میں ہے یہ ناکامی کا نوحہ گر
خرد کے عارضوں کا عشق افلاطون ہوتا ہے
اُترتا ہے جنوں اس کا' یہ جب نشتر چبھوتا ہے
وہیں سجدے کرے عالم جہاں پر عشق فرمائے
یہ وہ محمود ہے جو سومناتِ عقل کو ڈھائے
رہی خالی صراحی علمِ نو کی' عشق کی مَے سے
نہ راتیں آشنا اُس کی ہوئیں فریاد کی لَے سے
رہی کم تیری نظروں میں ترے شمشاد کی قیمت
عطا کی دوسروں کے سرو کو تُو نے مگر رفعت
مثالِ نَے خود اپنے آپ کو تُو نے کیا خالی
بنایا تُو نے دل اپنا نوائے غیر کا حالی
تُو خوانِ غیر سے ہے ایک ریزہ مانگتا پھرتا
تُو غیروں کی دکاں سے جنس اپنی کا ہوا جویا
جل اٹھی بزمِ مسلم کی چراغِ غیر سے آخر
لگی آگ اس کی مسجد کو شرارِ دیر سے آخر
حرم کی سرزمیں سے جب نکل کر آ گیا آہو
ہوا صیاد کے تیروں سے چھلنی اُس کا ہر پہلو
پریشاں مشکِ بو ہیں پنہاں گل کی' چمن اجڑا
خودی سے بھاگنے والے پھر اپنی سمت واپس آ
امانت دی گئی تجھ کو کتابِ پاک کی حکمت
کہیں سے ڈھونڈ لا اپنی وہی کھوئی ہوئی وحدت
حصارِ عافیت ملت ہے' ہم ملت کے ہیں درباں
ہوئے ترکِ شعارِ قوم سے ہم تارکِ ایماں
ہوا ہے ٹکڑے ٹکڑے ساقیِ دیرینہ کا ساغر
پریشاں بزمِ رندانِ حجازی ہو گئی یکسر

(باقی صفحہ 53 پر)

فقر

فقر درحقیقت خودی کا ایک ذیلی اخلاقی وصف ہے۔ اقبال کے ہاں یہ اصطلاح مفلسی، فقیری یا گداگری کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوئی، بلکہ مشہور حدیثِ نبویؐ "الفقر فخری" (فقر میرا فخر ہے) کے مفہوم میں استعمال ہوئی ہے۔ فقر کے معنی یہ ہیں کہ دل کو دنیا سے الگ رکھنا، باہمہ و بے ہمہ رہنا، دنیا کی کسی شے سے محبت نہ رکھنا، دنیا میں کسی چیز کی طلب نہ رکھنا سوائے سوزِ دل کے۔ نعمتیں، آسائشیں اور اسباب کی فراوانی انسان کو اندھا بنا دیتی ہیں۔ اس کے دل میں سوزِ قلب نہیں رہتا۔ وہ دنیوی علائق میں اس قدر پھنس جاتا ہے کہ پھر اسے اپنی روح کی پرورش کی فکر نہیں رہتی۔ اسی لئے اقبال نوجوانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ مناصب و مراتب پر کیوں نہ پہنچ جائیں، لیکن دل درویش رہنا چاہئے۔

تمنا دردِ دل کی ہو تو خدمت کر فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
(بانگ درا: غزل)

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا
(بانگ درا: خطاب بہ جوانانِ اسلام)

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ نگہ کی تیغ بازی
(بال جبریل: غزل 13)

نہ ایراں میں رہے باقی، نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ
(بال جبریل: حکیم سنائی سے)

گو فقر بھی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزیٔ بے سلطنتِ پرویز
اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیریں ہو جس فقر کی دستاویز
(بال جبریل: حکیم سنائی سے)

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نہ فقر کے لئے موزوں، نہ سلطنت کے لئے
وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری
(بال جبریل: حکیم سنائی سے)

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
(بال جبریل: غزل 36)

یا شرعِ مسلمانی، یا دیر کی دربانی
یا نعرۂ مستانہ، کعبہ ہو کہ بت خانہ
میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ
(بال جبریل: غزل 47)

فقر کے ہیں معجزات، تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم فقیہ و حکیم، فقر مسیحؑ و کلیمؑ
علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر!
فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ
علم کا "موجود" اور، فقر کا "موجود" اور
اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ، اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ
دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو
تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ
(بال جبریل: غزل 59)

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے، وہ آئینہ سازی
(بال جبریل: محبت)

کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو
آنکھیں مری بینا ہیں، ولیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند
ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں
پیدا کلۂ فقر سے ہو طرۂ دستار
باقی کلۂ فقر سے تھا ولولۂ حق!
طروں نے چڑھایا نشۂ خدمتِ سرکار
(بال جبریل: پنجاب کے پیرزادوں سے)

اِک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری
اک فقر سے شبیری، اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی، سرمایۂ شبیری
(بال جبریل: فقر)

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر، تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم، سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے، تُو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے، تونگری سے نہیں
(بال جبریل: مسلمان کا زوال)

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تُو نے
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار
اس بیت کا یہ مصرعِ اول ہے کہ جس میں
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار
قبضے میں یہ تلوار بھی آ جائے تو مومن
یا خالدِؓ جانباز ہے یا حیدرِؓ کرارؑ!
(ضرب کلیم: آزادیٔ شمشیر کے اعلان پر)

کسے خبر ہے کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی
(ضرب کلیم: سلطانی)

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی
سکوں پرستیٔ راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی
یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی
(ضرب کلیم: فقر و راہبی)

عشق

خودی اور ایمان ویقین کی پختگی اگر منزل ہے تو اس منزل تک پہنچنے کا واحد مستقیم راستہ عشق ہے۔ قاضی عبدالغفار نے کیا خوب لکھا ہے:

''اقبال کے سینے میں دو روحوں کا آشیانہ تھا۔ ایک شاعر کی حُسن پرست اور عشق پرور روح' اور ایک مسلمان کی ہنگامہ خیز اور شورش انگیز روح۔ آخری دور میں حسن پرست روح ساکن اور مسلمان کی روح اس طرح ہنگامہ آرا ہو گئی کہ شاعر اپنا پیام بن کر ہر طرف چھا گیا۔ اب سننے والے یہ نہیں دیکھتے کہ زبان اردو ہے یا فارسی۔ اقبال کی شاعری نے زبان اور طرزِ ادا کے امتیازات سے قطع نظر کر لی۔ بس' کہے جاتا ہے' کہے جاتا ہے جو اس کو کہنا ہے۔ ہرڈر نے کہا تھا: شاعری نوعِ انسانی کی مادری زبان ہے۔ اقبال کی شاعری اس قول کی تشریح ہے۔ اس کے لئے اردو اور فارسی کا امتیاز ایک قصۂ پارینہ ہے۔''

ابتدائی زمانے میں انہوں نے لفظ ''عشق'' کو اردو اور فارسی کی عام شاعری کے معنوں میں استعمال کیا ہے جو لفظ ''حسن'' کے مقابل آتا ہے۔ اس مفہوم میں انہوں نے کئی نظمیں لکھیں۔ بعض تلف کر دیں۔ بعض نظمیں جو ''بانگ درا'' میں شامل ہیں' ان میں وصال' حسن و عشق' سلیمی' محبت'.... کی گود میں بلی دیکھ کر' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں' لیکن بعد کی شاعری میں لفظ عشق ایک اصطلاح بن گیا اور حسن کی بجائے ''عقل'' کے مقابل آ کر خودی کا حصہ دار بن گیا۔

اس عشق نے اقبال کی شخصیت کو بنایا' پروان چڑھایا اور اس کی شاعری کو نت نئے معانی' افکار کی جولانی اور قوت تاثیر عطا کی۔ اپنی شخصیت کو عشق کی سان پر چڑھانے کے لئے ان کا طریقہ ''آہِ سحر گاہی'' تھا۔ جب سارا عالم خوابِ غفلت میں پڑا سوتا رہتا' اس اخیر شب میں اقبال کا اٹھنا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا' پھر گڑگڑانا اور رونا۔ اقبال علی الصبح اٹھنے کا بہت ہی اہتمام رکھتے تھے۔ سفر و حضر' ہر مقام اور ہر کہیں ان کے لئے سحر خیزی ضروری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جوانوں میں اپنی اس آہ و سوز اور درد و تپش کو دیکھنے کی تمنا کرتے تھے اور دعائیں کرتے کہ الٰہی! یہ میرا سوزِ جگر اور میرا عشق آج کل کے مسلم نو جوانوں کو بخش دے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق' میری نظر بخش دے

شیشۂ دہر میں مانند مے ناب ہے عشق — روحِ خورشید ہے' خونِ رگِ مہتاب ہے عشق
دلِ ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی — نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی
کہیں سامانِ مسرت' کہیں سازِ غم ہے — کہیں گوہر ہے' کہیں اشک' کہیں شبنم ہے
(بانگِ درا:.... کی گود میں بلی دیکھ کر)

ہے ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق — عقلِ انسانی ہے فانی' زندۂ جاوید عشق
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے — عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں — روح میں غم کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں
ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی — زندگانی ہے عدم ناآشنا محبوب کی
(بانگِ درا:فلسفۂ غم)

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل — عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد سے سُبک گامِ عمل — عقل سمجھی ہی نہیں معنیٔ پیغام ابھی
(بالِ جبریل:غزل)

گرچہ تُو زندانیٔ اسباب ہے — قلب کو لیکن ذرا آزاد دیکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں — عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ
(بالِ جبریل:غزل)

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں
(بالِ جبریل:غزل14)

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم — عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق — شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم
(بالِ جبریل:غزل16)

اپنی شخصیت کو عشق کی سان پر چڑھانے کے لئے ان کا طریقہ ''آہِ سحر گاہی'' تھا۔ جب سارا عالم خوابِ غفلت میں پڑا سوتا رہتا' اس اخیر شب میں اقبال کا اٹھنا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا' پھر گڑگڑانا اور رونا۔ اقبال علی الصبح اٹھنے کا بہت ہی اہتمام رکھتے تھے۔

اگر ہو عشق' تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو' تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق
(بالِ جبریل:غزل13)

عشق بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا — نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف
کھول کے کیا بیاں کروں سرِّ مقامِ مرگ و عشق — عشق ہے مرگِ باشرف' مرگ حیاتِ بے شرف
(بالِ جبریل:غزل16)

خرد نے مجھ کو عطا کی نظرِ حکیمانہ — سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ
نہ بادہ ہے' نہ صراحی' نہ دورِ پیمانہ — فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ
مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال — مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ
(بالِ جبریل:غزل28)

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
عطار ہو' رومی ہو' رازی ہو' غزالی ہو — کچھ ہاتھ نہیں آتا' بے آہِ سحر گاہی
(بالِ جبریل:غزل34)

عشق تری انتہا' عشق مری انتہا — تُو بھی ابھی ناتمام' میں بھی ابھی ناتمام

آہ! کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز ورنہ ہے مالِ فقیر' سلطنت روم و شام
(بالِ جبریل: غزل 41)

جمالِ عشق و مستی نے نوازی جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی
(بالِ جبریل: رباعی)

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر کبھی مولا علی خیبر شکن عشق
(بالِ جبریل: رباعی)

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق کبھی شاہ شہاں نوشیرواں عشق
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش کبھی عریاں و بے تیغ و سناں عشق
(بالِ جبریل: رباعی)

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل' عشق سے صاحب فروغ عشق ہے اصلِ حیات' موت ہے اس پر حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو عشق خود اک سیل ہے' سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل' عشق دلِ مصطفےٰ عشق خدا کا رسول' عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک عشق ہے صہبائے خام' عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہِ حرم' عشق امیرِ جنود عشق ہے ابن السبیل' اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات عشق سے نورِ حیات' عشق سے نارِ حیات
(بالِ جبریل: مسجد قرطبہ)

عقل ہے بے زمام ابھی' عشق ہے بے مقام ابھی نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے ناتمام ابھی
دانش و دین و علم و فن' بندگیِ ہوس تمام عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہرِ زندگی ہے عشق' جوہرِ عشق ہے خودی آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیِ نیام ابھی
(بالِ جبریل: فرشتوں کا گیت)

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق عشق نہ ہو تو شرع و دیں' بتکدۂ تصورات
صدقِ خلیل بھی ہے عشق' صبرِ حسین بھی ہے عشق معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق
(بالِ جبریل: ذوق و شوق)

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا عشق تمام مصطفےٰ' عقل تمام بولہب
گاہ بحیلہ می برد گاہ بزور می کشد عشق کی ابتدا عجب' عشق کی انتہا عجب
(بالِ جبریل: ذوق و شوق)

علم نے مجھ سے کہا' عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا' علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن' کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور' علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات' عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات' عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال' عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات' سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام' صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں' عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں' اور یقیں فتحِ باب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال' لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال' عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب' عشق ہے ام الکتاب
(ضربِ کلیم: علم و عشق)

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں "بقامت کہتر و بقیمت بہتر"
کی مصداقِ کامل قرار دیا جاسکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

اس کتاب کا نیا نظرثانی و اضافہ شدہ ایڈیشن نئی آب و تاب کے
ساتھ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر آ چکا ہے
جس میں مندرجہ ذیل نئے مضامین کا اضافہ کیا گیا ہے:

☆ فکرِ اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ اور ہماری ذمہ داریاں
از قلم: ڈاکٹر اسرار احمد

☆ حیات و سیرتِ اقبال ☆ فلسفۂ اقبال

☆ ملتِ اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام
از قلم: پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

☆ اقبال اور قرآن از قلم: سید نذیر نیازی

عمدہ کتابت' دیدہ زیب طباعت' صفحات ۱۴۴

قیمت: اشاعت خاص (سفید کاغذ' پائیدار و خوبصورت جلد) ۷۲ روپے
اشاعت عام (نیوز پیپر ایڈیشن) ۳۰ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' ۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

ضرورتِ رشتہ

بیوہ عمر 32 سال' پرائمری۔ لڑکی عمر 22 سال' بی۔ اے۔ لڑکی عمر 17 سال' میٹرک۔ لڑکا عمر 23 سال' ڈسپنسر۔ قوم ذات پٹھان ضلع پشاور سے تعلق حال مقیم جھنگ صدر' پنجاب کے لئے دینی گھرانوں سے مناسب رشتہ درکار ہے۔

برائے رابطہ: مدیر "ندائے خلافت" فون: 03-5869501

عشقِ قرآن

اقبال کی زندگی پر کلامِ الٰہی جس قدر اثر انداز ہوا ہے اتنا وہ کسی شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں اور نہ کسی کتاب نے ان پر ایسا اثر ڈالا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں کہ:

''اقبال کا ایمان چونکہ ''نومسلم'' کا سا ہے' خاندانی وراثت کے طور پر نہیں ملا ہے' اس لئے ان کے اندر نسلی مسلمانوں کے مقابلے میں قرآن سے شغف' تعلق اور شعور و احساس کے ساتھ مطالعے اور تلاوت کا ذوق بہت زیادہ ہے۔''

قرآن کا پڑھنا عام کتابوں کے پڑھنے سے بہت ہی مختلف رہا ہے' جیسا کہ خود اقبال نے اپنے قرآن مجید پڑھنے کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ان کا یہ ہمیشہ کا دستور تھا کہ روزانہ بعد نماز فجر قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اقبال کے والد جب انہیں دیکھتے تو فرماتے ''کیا کر رہے ہو؟'' اقبال جواب دیتے: ''قرآن پڑھ رہا ہوں''۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر ایک دن اقبال نے پوچھا: ''ابا جان! آپ مجھ سے روزانہ پوچھتے ہیں' اور میں ایک ہی جواب دیتا ہوں' اور پھر آپ خاموش چلے جاتے ہیں۔'' تو انہوں نے جواب دیا: ''میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم قرآن اس طرح پڑھا کرو کہ جیسے قرآن اسی وقت تم پر نازل ہو رہا ہے۔'' اس کے بعد سے اقبال نے قرآن برابر سمجھ کر پڑھنا شروع کیا اور اس طرح کہ گویا وہ واقعی ان پر نازل ہو رہا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کرتے گزاری۔ قرآن مجید پڑھتے' قرآن سوچتے' قرآن بولتے۔ نوجوانانِ ملت کے لئے وہ ایک پیغام چھوڑ گئے ہیں:

''میں اُس گھر کو صد ہزار تحسین کے قابل سمجھتا ہوں' جس گھر میں علی الصبح تلاوت قرآن مجید کی آواز آئے۔'' یعنی تلاوت ہو اور آواز کے ساتھ ہو۔''

زمیں کیا' آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآن کو چلیپا کر دیا تو نے
زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بُتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

(بانگ درا: تصویر درد)

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے
پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں' تُو بھی تو دلدار نہیں

(بانگ درا: شکوہ)

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی' مگر تم کیا ہو؟
ہاتھ پر ہاتھ دھرے' منتظرِ فردا ہو؟

(بانگ درا: جواب شکوہ)

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو! یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے' نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

(بانگ درا: جواب شکوہ)

اے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر
مجھے معلوم کیا' وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟!
محمدؐ بھی ترا' جبریل بھی' قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں' ترجماں تیرا ہے یا میرا؟!

(بالِ جبریل: غزل 2)

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و مئے گلگوں
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند!
احکام ترے حق ہیں' مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پازند

(بالِ جبریل: غزل 16)

وہ دانائے سُبل' ختم الرسل' مولائے کل' جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول' وہی آخر
وہی قرآں' وہی فرقاں' وہی یٰسیں' وہی طٰہٰ!

(بالِ جبریل: غزل 1)

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب' بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(بالِ جبریل: تن بہ تقدیر)

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار' نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں' قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(ضربِ کلیم: اجتہاد)

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے' حقیقت میں ہے قرآن

(ضربِ کلیم: مردِ مسلماں)

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

(ضربِ کلیم: اشتراکیت)

جانتا ہوں میں' یہ امت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

(ارمغان حجاز: ابلیس ''اپنے مشیروں سے'')

عشقِ رسول ﷺ

عشق اقبال کی باطنی زندگی میں ارتقا پا کر عشق رسولؐ بن گیا ہے۔ جب وہ رسولِ کریم ﷺ کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا شعری وجدان جوش مارنے لگتا ہے اور اشعار خودبخود نعت کی صورت اختیار کرنے لگتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے محبت و عقیدت کے چشمے پھوٹ پڑے ہیں۔

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است　　آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است
شور عشقش در نئے خاموشِ من　　می تپد صد نغمہ در آغوشِ من

جوں جوں زندگی کے دن گزرتے گئے' آنحضور ﷺ کے ساتھ اقبال کا عشق جنون کی صورت اختیار کرتا گیا' یہاں تک کہ آخری عمر میں جب بھی ان کی مجلس میں نبی کریم ﷺ کا ذکر آتا یا مدینۂ منورہ کا ذکر ہوتا تو اقبال بے قرار ہو جاتے' آنکھیں آبدیدہ ہو جاتیں' آنسو رواں ہو جاتے' بعض اوقات تو ہچکیاں بندھ جاتیں۔ مدینہ کا نام آتے ہی پیمانۂ عشق لبریز ہو جاتا اور اشکِ محبت کی جھڑیاں لگ جاتیں۔ وہ حج یا عمرے کے لئے بڑے بے تاب رہے لیکن انہیں یہ سعادت جسمانی طور پر نصیب نہ ہو سکی۔ لیکن انہوں نے ''ارمغانِ حجاز'' کے ایک باب بعنوان ''حضورِ رسالتؐ'' میں آپؐ کو مخاطب کر کے اپنے ذاتی وارداتِ قلب اور امتِ مسلمہ کی دل گداز تصویر کھینچ کر رکھ دی۔

اقبال کے اکثر و بیشتر اشعار میں عشقِ رسولؐ کی تب و تاب نمایاں ہے۔ یہاں چند اردو اشعار کے انتخاب کے علاوہ ''ارمغانِ حجاز'' کے اس حصے کا انتخاب (مع ترجمہ) شامل ہے جس میں اقبال حضورِ رسالتؐ روحانی طور پر پیش ہوتے ہیں۔

سالار کارواں ہے میرِ حجاز اپنا　　اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
(بانگِ درا: ترانۂ ملی)

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے　　دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے
(بانگِ درا: جوابِ شکوہ)

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں
(بانگِ درا: جوابِ شکوہ)

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس　　صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس
(بانگِ درا: صدیقؓ)

اے بادِ صبا! کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا　　قبضے سے امت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی
(بانگِ درا: غزل)

اے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر　　مجھے معلوم کیا' وہ رازداں تیرا ہے یا میرا؟
محمدؐ بھی ترا' جبریل بھی' قرآن بھی تیرا　　مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا؟
(بالِ جبریل: غزل 2)

وہ دانائے سُبل' ختم الرسل' مولائے کُل جس نے　　غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول' وہی آخر　　وہی قرآں' وہی فرقاں' وہی یٰسیں' وہی طٰہٰ
(بالِ جبریل: نادر شاہ غازی)

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر　　مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری
(بالِ جبریل: غزل 14)

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر　　اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

جوں جوں زندگی کے دن گزرتے گئے' آنحضور ﷺ کے ساتھ اقبال کا عشق جنون کی صورت اختیار کرتا گیا' یہاں تک کہ آخری عمر میں جب بھی ان کی مجلس میں نبی کریم ﷺ کا ذکر آتا یا مدینۂ منورہ کا ذکر ہوتا تو اقبال بے قرار ہو جاتے' آنکھیں آبدیدہ ہو جاتیں' آنسو رواں ہو جاتے' بعض اوقات تو ہچکیاں بندھ جاتیں۔

وہ لذتِ آشوب نہیں' بحرِ عرب میں　　پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ　　آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے
(ضربِ کلیم: اے روحِ محمدؐ)

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا　　روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات　　اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
(ضربِ کلیم: ابلیس کا فرمان)

سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است　　چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر بہ او نہ رسیدی' تمام بولہبی است
(ارمغانِ حجاز: حسین احمد)

حضورِ رسالتؐ

اب جو اشعار پیش کئے جا رہے ہیں' وہ علامہ اقبال کی لازوال تخلیق ''ارمغانِ حجاز'' کے اس باب سے ماخوذ ہیں' جس کا عنوان ہے: ''حضورِ رسالتؐ ''۔ اس باب کا آغاز وہ عزت بخاری کے اس مشہور شعر سے کرتے ہیں ۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

(رسولِ کریم ﷺ کا شہر مدینہ یا روضۂ مبارک ایک ایسی ادب گاہ ہے جہاں حضرت جنید بغدادی اور حضرت بایزید بسطامی جیسے عظیم اولیاء بھی سانس گم کئے ہوئے آتے ہیں کہ کہیں سانس لینا بھی بے ادبی میں شامل نہ ہو جائے۔)

شہرِ نبویؐ کو عزت بخاری کی زبان میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے بعد اقبال عالمِ خیال میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا سفر شروع کرتے ہیں' اور اس تصور میں وہ قافلۂ شوق

کے ہمراہ نرم ریگستانی زمین پر رواں دواں ہیں۔ ذوقِ حضوری اور شوق و محبت میں یہ ریت ان کو ریشم سے بھی زیادہ نرم محسوس ہو رہی ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ہر ذرہ دل بن کے دھڑک رہا ہے۔ اقبال ساربان سے کہتے ہیں کہ ان دھڑکتے ہوئے دلوں کا خیال کرے اور نرم روی اختیار کرے۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است — شبش کوتاہ و روز او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ — چو ما ہر ذرۂ او دردمند است

(مدینے کے راستے کا صحرا کتنا اچھا ہے کہ اس کی شام صبح کی مانند مسکراتی ہوئی ہے جس میں ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں کی رات چھوٹی اور دن لمبا ہے۔ اے راہی! اس صحرا کی ریت پر بڑی نرمی سے قدم رکھ کیونکہ اس کا ہر ذرہ میری طرح دردمند ہے۔)

پھر اقبال اسی عالمِ خیال میں رسول اللہ ﷺ کے روضۂ مبارک پر حاضر ہوتے ہیں۔ درود وسلام پڑھتے ہیں۔ محبت و شوق کی زبان ان کے دل کی ترجمان بن جاتی ہے اور وہ اس مبارک وقت اور سنہری موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا حالِ دل بیان کرتے ہیں۔ امت اور عالمِ اسلام کی حالتِ زار' ان کے مسائل اور مشکلات' آزمائشیں اور امتحانات' نیز مغربی تہذیب، تعلیم اور مادی فلسفوں اور تحریکوں کے سامنے مسلمانوں کی بے بسی' اپنے اپنے وطن میں ان کی غریب الوطنی اور خود مسلمانانِ ہند میں اپنے پیغام کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں۔ کبھی ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور کبھی دل کی بات زبان پر آ جاتی ہے۔ اقبال کا یہ روحانی سفر اس زمانے میں ہوا جب ان کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ حج اور زیاراتِ مقدسہ کی حسرت و تمنا ان کے دل میں جاگزیں تھی۔ لیکن ذوقِ سفر سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ جسمانی طور پر دربارِ رسول تک پاپیادہ گئے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس وقت جبکہ میری زندگی کا آفتاب لبِ بام ہے' اگر میں نے مدینہ منورہ کا قصد کیا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ جس طرح شام کے وقت پرندے اپنے اپنے آشیانے (حقیقی مسکن) کی طرف جاتے ہیں' اسی طرح میری روح بھی

> اس امت کی پریشانی' بدحالی اور بے نظمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جماعت ہے اور امام نہیں۔ افراد ہیں مگر نظام نہیں۔

اب اپنے حقیقی آشیانے کی طرف واپس جانا چاہتی ہے۔

بایں پیری رہِ یثرب گرفتم — نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام — کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

(میں نے اس بڑھاپے میں یثرب کی راہ اختیار کی ہے۔ عاشقانہ نوا خوانی کی مستی اور سرور میں چلا جا رہا ہوں' اس پرندے کی طرح جو صحرا میں شام کے وقت اپنے گھونسلے کی فکر میں پر کھولتا ہے۔)

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان جب اقبال کی اونٹنی اپنی رفتار تیز کر دیتی ہے تو وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ سوار بہت خستہ و بیمار ہے' لیکن اونٹنی ان کا مشورہ نہیں مانتی۔ وہ مستانہ وار قدم تیز تر کرتی جاتی ہے' گویا یہ صحرا نہیں بلکہ ریشم کا نرم فرش بچھا ہوا ہے۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو — کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی — بپایش ریگ ایں صحرا حریر است

(صبح کے وقت میں نے اونٹنی سے کہا کہ ذرا نرمی اور آہستگی سے چل۔ تجھ پر جو شخص سوار ہے وہ کمزور' بیمار اور بوڑھا ہے۔ میں نے جتنا زیادہ اصرار کیا' اس نے اتنا ہی قدم تیز تر کر دیئے' کیونکہ وہ بھی جلوۂ رسول کا شوق رکھتی تھی۔ جب وہ چلتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ صحرا کی ریت پر نہیں چل رہی' بلکہ ریشمی کپڑے پر چل رہی ہے۔)

اب یہ کاروانِ مدینہ درود وسلام کی سوغات لئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اس پُرکیف فضا میں اقبال تمنا کرتے ہیں کہ کاش ان کو اس گرم ریت پر ایک ایسا سجدہ میسر ہو جو ان کی پیشانی کے لئے نقشِ دوام بن جائے۔ وہ اہلِ قافلہ کو بھی اسی سجدۂ شوق کا مشورہ دیتے ہیں۔

چہ خوش صحرا کہ در وے کارواں ہا — درودے خواند و محمل براند
بہ ریگِ گرمِ او آور سجودے — جبیں را سوز' تا داغے بماند

(کتنا اچھا ہے یہ صحرا' جس میں قافلے والے درود پڑھتے جاتے ہیں اور محمل والے اونٹوں کو ہانکتے جاتے ہیں۔ اس صحرا کی گرم ریت پر سجدے کر۔ پیشانی کو اس کے سوز سے جلا تاکہ اس پر ایک داغ ہمیشہ کے لئے رہ جائے۔)

ذوق و شوق کا غلبہ ہوتا ہے تو عراقی اور جامی کے اشعار بے ساختہ ان کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔

گہے شعرِ عراقی را بخوانم — گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را — شریکِ نغمہ ہائے ساربانم

(کبھی میں فخر الدین عراقی کے شعر پڑھنے لگتا ہوں اور کبھی مولانا عبدالرحمٰن جامی کے شعر میری جان میں آگ لگاتے ہیں۔ اگرچہ میں عربوں کا آہنگ نہیں جانتا' لیکن میں ساربان کے نغمے میں' آواز سے آواز ملا کر' شریک ہوں۔)

> لادینیت کے اس سیلاب اور مادہ پرستانہ معاشی فلسفے کا مقابلہ اگر کسی چیز سے ہوسکتا ہے تو وہ زہد اور محبت ہے۔ اس پر اگر کوئی چیز غالب آ سکتی ہے تو وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی زاہدانہ اور عاشقانہ زندگی ہے۔

لوگ حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں کہ یہ عجمی آخر کس زبان میں اشعار پڑھ رہا ہے' جو سمجھ میں نہیں آتے لیکن دل کو درد و محبت سے اس طرح بھر دیتے ہیں کہ آدمی کو کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا اور پانی کے بغیر بھی اس کی تشنگی دور ہو جاتی ہے۔

امیرِ کارواں! آں اعجمی کیست؟ — سرودِ اُو بآہنگِ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابیِ اُو — خنک دل در بیابانے تواں زیست

(اے امیرِ کارواں! یہ تیرے قافلے میں کون عجمی ہے جس کا سرود' جس کی لے عرب کے آہنگ سے جدا ہے۔ یہ ایسا نغمہ الاپ رہا ہے جس سے اس کا دل اس بیاباں میں گرمی کے باوجود سیرابی اور ٹھنڈک محسوس کر رہا ہے۔)

راستے کی دشواریوں اور مشقتوں میں ان کو لطف آنے لگتا ہے۔ شب بیداری' کم خوابی اور بے آرامی سے سرور حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس راستے کو طویل نہیں سمجھتے اور جلد پہنچنے کی آرزو نہیں کرتے' بلکہ اپنے ساربان سے اس کی خواہش کرتے ہیں کہ وہ اس سے بھی زیادہ طویل اور دراز تر راستے سے لے چلے' تاکہ اس بہانے سے ذوق و شوق کی مدت بھی کچھ دراز ہو سکے اور انتظار کا لطف دوبالا ہو سکے۔

غمِ راہی نشاط آمیز تر کن — فغانش را جنوں انگیز تر کن
بگیر اے سارباں راہِ درازے — مرا سوزِ جدائی تیز تر کن

(اے ساربان! مجھ راہی کے غم کو زیادہ نشاط آمیز اور لذت خیز بنا۔ میری آہ و فغاں میں زیادہ جنوں پیدا کر۔ اے ساربان! کوئی لمبا راستہ اختیار کر۔ میرا سوزِ جدائی اور تیز کر۔)

اسی سرور و شوق اور کیف و مستی کے ساتھ وہ سارا راستہ طے کرتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچتے ہیں' اور اپنے رفیقِ سفر سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں ایک ہی زلف کے اسیر ہیں۔ آج ہم کو اپنے دل کی مراد بر لانے اور اپنے آقا اور محبوب کے قدموں پر اپنی پلکیں بچھانے کا موقع

ملا ہے اس لئے آج ہمیں اپنی آنکھوں پر سے پابندی ہٹا لینی چاہئے اور اس سیلاب اشک کو جو عرصے سے امڈنے کے لئے بے چین ہے تھوڑی دیر کے لئے آزاد چھوڑ دینا چاہئے۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم — من و تو کشتہ شانِ جمالیم
دو حرفے بر مرادِ دل بگوییم — بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

(آ اے میرے ہم نفس ہم مل کر روئیں کیونکہ میں اور تو ہم دونوں اس کی شانِ جمال جلوۂ محبوب کے مارے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں اپنے دل کی مراد کے بارے میں کچھ کہیں اور روضۂ رسولؐ پر جا کر اپنے خواجہؐ کے پاؤں پر اپنی آنکھیں ملیں۔)

اقبال اپنے اوپر رشک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیسی خوش نصیبی اور کیسا مقام مسرت ہے کہ یہ سعادت اور نعمت ان کے نصیب میں آئی اور اس درویش کو نااہلی کے باوجود اس دربارِ شاہی میں نوازا گیا جہاں بڑے بڑے دانشوروں اور اورنگ نشینوں کو باریابی کی توفیق حاصل نہ ہو سکی۔

حکیماں را بہا کمتر نہادند — بنا داں جلوۂ مستانہ دادند
چہ خوش بختے ' چہ خرم روزگارے — درِ سلطاں بہ درویشے کشادند

(یہاں مدینہ منورہ میں اہل عقل و حکمت کی بہت کم قیمت پڑتی ہے۔ یہاں تو ان نادانوں کو جلوۂ مستانہ سے نوازا جاتا ہے جو عشقِ رسولؐ میں گم ہیں۔ میں کیسا خوش نصیب ہوں اور میری زندگی کیسی خوش و خرم ہے کہ مجھ جیسے درویش پر سلطان کے دروازے کھول دیئے گئے۔)

لیکن اس خوش نصیبی' سرور و مستی اور جذب و شوق میں بھی وہ امت مسلمہ اور عالم اسلامیہ کو فراموش نہیں کرتے اور پوری صدق دلی' صدق بیانی اور قادر الکلامی کے ساتھ ان کی حالتِ زار اور دردِ دل' کتاب کی طرح کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔

مسلماں آں فقیرِ کج کلاہے — رمید از سینۂ او سوزِ آہے
دلش نالد' چرا نالد؟ نداند — نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

(مسلمان جس کی شان یہ ہے کہ وہ فقیری میں بھی بادشاہ ہوتا ہے اور بے سروسامانی میں بھی سوائے باری تعالیٰ کے ہر ایک سے بے نیاز ہوتا ہے' وہ آج اپنی مسلمانی شان کھو چکا ہے۔ اس کے سینے میں اسلام کی حرارت ختم ہو چکی ہے۔ آج اس کا دل رو رہا ہے۔ کیوں رو رہا ہے؟ یہ اسے معلوم نہیں۔ یا رسول اللہ ﷺ! ایک نگاہِ کرم کہ اس کی تقدیر بدل جائے۔)

تب و تابِ دل از سوزِ غمِ تست — نوائے من ز تاثیرِ دمِ تست
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند — ندیدم بندۂ کو محرمِ تست

(میرے دل کی تب و تاب' یا رسول اللہؐ تیرے سوزِ عشق کی وجہ سے ہے۔ میری شاعری میں اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ تیرے دم سے ہے۔ میں روتا اس لئے ہوں کہ ہندوستان میں میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو تیرا محرم ہو' تجھے جاننے اور پہچاننے والا ہو۔)

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست — بایں خاک آفتابے را گزر نیست
بما کن گوشۂ چشمے کہ در شرق — مسلمانے زما بیچارہ تر نیست

(ہندوستان کے غلاموں کی شب کی سحر نہیں ہے۔ اس مٹی میں سورج کا گزر نہیں۔ ہماری طرف نگاہِ کرم کر' کیونکہ مشرق میں ہندوستان کے غلام مسلمانوں سے زیادہ کوئی بے چارہ' بے کس اور تنہا نہیں۔)

اس امت کی بڑی آزمائش یہ ہے کہ یہ بامِ بلند سے گری ہے' اور جو جتنا اوپر سے گرتا ہے' اتنی ہی زیادہ سخت چوٹ اسے آتی ہے۔

چہ گویم زاں فقیرے دردمندے — مسلمانے بہ گوہر ارجمندے
خدا ایں سخت جاں را یار بادا — کہ اُفتاد است از بامِ بلندے

(میں اس دردمند فقیر یعنی مسلمان کے بارے میں کیا عرض کروں۔ کبھی یہ قیمتی گوہر ارجمند تھا۔ خدا اس سخت جان کا یار و مددگار ہو۔ یہ بہت اونچی چھت سے گرا ہے۔)

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس امت کی پریشانی' بدحالی اور بے نظمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جماعت ہے اور امام نہیں۔ افراد ہیں مگر نظام نہیں۔

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است — ہنوز ایں کارواں' دور از مقام است
زکارِ بے نظامِ او چہ گویم — تو می دانی کہ ملت بے امام است

(مسلمانوں کے لئے یہ نیلا آسمان ابھی تک ٹیڑھی چال چل رہا ہے۔ مسلمانوں کا قافلہ ابھی تک اپنی منزل سے دور ہے۔ ان کی بے نظمی کے متعلق کیا عرض کروں۔ تُو جانتا ہے کہ یہ ملت بے امام ہے۔)

وہ کہتے ہیں کہ اس کے خون میں اب وہ تب و تاب اور اس کے اندر مردم خیزی کی وہ صلاحیت باقی نہیں رہی' جو اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ اب عرصے سے اس کی نیامِ بے شمشیر اور اس کی "کشتِ ویراں" لالہ و گُل سے محروم ہے۔

نماند آں تاب و تب در خونِ نابش — نروید لالہ از کشتِ خرابش
نیامِ اُو تہی چوں کیسۂ او — بطاقِ خانۂ ویراں کتابش

(آج کے مسلمان میں وہ پہلی سی تب و تاب نہیں رہی۔ یہی سبب ہے کہ اس کے ویران کھیت میں لالہ و گُل نہیں اگتے۔ اس کی نیام اس کی جیب کی طرح خالی ہے۔ اس نے اپنی کتاب قرآن کسی ویران گھر کے طاق میں رکھ دی ہے۔)

وہ کہتے ہیں کہ یہ امت اپنے سرمایۂ آرزو اور ذوقِ جستجو سے محروم ہو کر رنگ و بُو میں گرفتار ہو گئی ہے۔ اس کے کان نرم و نازک نغموں کے خوگر ہو گئے ہیں اور مردانِ حُر کی آواز اس کے لئے نامانوس ہو چکی ہے۔

> اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی پوری زندگی عصرِ حاضر سے کشمکش میں گزری۔ انہوں نے مغربی تہذیب اور مادی فلسفے کا نہ صرف انکار کیا بلکہ آگے بڑھ کر اس پر سخت تنقید بھی کی۔ اس کو چیلنج کیا اور بڑی جرأت' روشن ضمیری اور گہرائی کے ساتھ اس کو کھوٹا ثابت کیا۔

دلِ خود را اسیرِ رنگ و بُو کرد — تہی از ذوق و شوق و آرزو کرد
صفیرِ شاہبازاں کم شناسد — کہ گوشش باطنینِ پشہ خُو کرد

(آج کے مسلمان نے اپنے دل کو رنگ و بو کا اسیر کر لیا ہے۔ خود کو ذوق و شوق اور آرزو سے خالی کر لیا ہے۔ وہ شاہبازوں کی آواز نہیں پہچانتا کیونکہ اس نے اپنے کانوں کو مچھر کی بھنبھناہٹ سننے کا عادی بنا لیا ہے۔)

اب نہ اس کی آنکھ میں یقین کا نور اور عشق کا سرور ہے' نہ اس کا دل کسی کی محبت میں مخمور' نہ اس کا سینہ کسی کی یاد سے معمور ہے۔ وہ حضوری سے بہت دور اور منزلِ مقصود سے ناآشنا اور مہجور ہے۔

بچشمِ او نہ نور و نے سرور است — نہ دل در سینۂ او ناصبور است
خدا آں اُمتے را یار بادا — کہ مرگِ او زجانِ بے حضور است

(اس کی آنکھ میں نہ نور ہے اور نہ سرور ہے۔ نہ اس کے سینے میں بے قرار دل ہے۔ اس امت کا خدا ہی یار و مددگار ہے کہ جس کی موت بے حضور جان سے ہے' یعنی اس کی زندگی ایسی ہے جس میں اس کا خدا پر یقین نہیں ہے۔)

پھر اقبال اس کے شاندار ماضی کا موازنہ اس کے داغ دار حال سے کرتے ہیں۔ وہ بڑی بلاغت اور خوش اسلوبی کے ساتھ کہتے ہیں کہ جس کو آپ نے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا اور ناز و نعم میں رکھا تھا' وہ آج ان صحراؤں میں اپنا رزق تلاش کرنے اور دربدر بھٹکنے پر

مجبور ہے۔

مپرس از من کہ احوالش حسپان است — زمینش بدگہر چوں آسمان است
برآں مرغے کہ پروردی بانجیر — تلاشِ دانہ در صحرا گران است

(مجھ سے مت پوچھئے کہ مسلمان کا کیا احوال ہے۔ اس کی زمین بھی آسمان کی طرح بدگہر اور بدحال ہے یعنی آسمان بھی اس کے موافق نہیں اور زمین بھی۔ اس پرندے پر، جس کی پرورش آپ نے انجیریں کھلا کر کی ہے، صحرا میں دانہ تلاش کرنا بھاری ہو گیا ہے۔)

پھر اقبال رسول کریم ﷺ کے حضور لادینیت کے اس طوفان بلاخیز کا ذکر کرتے ہیں جو عالم اسلام کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اقبال اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اسلامی ممالک میں لادینیت کا سب سے بڑا راستہ خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر، روحانی خلا اور قلب کی برودت ہے۔ مسرفانہ زندگی سے اس میں اور مدد مل رہی ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ لادینیت کے اس سیلاب اور مادہ پرستانہ معاشی فلسفے کا مقابلہ اگر کسی چیز سے ہو سکتا ہے تو وہ زہد اور محبت ہے۔ اس پر اگر کوئی چیز غالب آ سکتی ہے تو وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی

> وہ عالمِ دین کتنا مفلس و نادار ہے جو علم وافر، زبانِ گہرافشاں اور ذہن رساں کا مالک ہے، لیکن اس کی آنکھ محبت کے ایک آنسو اور دل کی ایک تڑپ سے بھی نا آشنا ہے۔

زاہدانہ اور عاشقانہ زندگی ہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے اس مثالی زندگی کی آرزو کرتے ہیں، جو زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایسی زندگی وجود میں آ جائے تو ساری دنیا اس کے سامنے سر جھکانے اور اس کا احترام کرنے پر مجبور ہو گی۔

دگرگوں کرد لادینی جہاں را — ز آثارِ بدن گفتند جاں را
ازاں فقرے کہ باصدیقؓ دادی — بشورے آور ایں آسودہ جاں را

(عصرِ حاضر میں لادینیت نے جہان کو تہ و بالا کر دیا۔ مادیت اس حد تک پھیل چکی ہے کہ آج روح کو بھی جسم کے نشانات میں سے، یعنی جسم کی طرح مادی کہا جا رہا ہے۔ اس فقیری سے، جو آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو عطا کی تھی، مسلمان کی آسودہ اور آرام پسند زندگی میں ایک ولولہ اور شور پیدا کریں۔)

اقبال مسلمانوں کے زوال کا سبب غربت و افلاس اور مادی وسائل کی کمی کو نہیں سمجھتے بلکہ اس کی توجیہہ اس "شعلۂ زندگی" کی افسردگی سے کرتے ہیں جو کسی زمانے میں ان کے سینے کے اندر فروزاں تھا۔ جب یہ درویش اور فقیر ایک اللہ کے لئے سجدہ ریز تھے اور کسی دوسرے کا اقتدار اور اختیار تسلیم نہیں کرتے تھے، اس وقت شہنشاہوں کا گریبان ان کے ہاتھ میں تھا، لیکن جب یہ شعلہ سرد ہو گیا تو ان کو درگاہوں اور خانقاہوں میں پناہ لینی پڑی۔

فقیراں تا بمسجد صف کشیدند — گریبانِ شہنشاہاں دریدند
چوں آں آتش درونِ سینہ افسرد — مسلماناں بدرگاہاں خزیدند

(جب تک مسلمان، جن میں فقیری کی شان تھی، مسجد میں صف آرا رہے، وہ شہنشاہوں کے گریبان پھاڑتے رہے۔ جب فقر کی وہ آگ مسلمانوں کے سینوں میں بجھ گئی تو وہ خانقاہوں اور درگاہوں تک محدود ہو کر رہ گئے۔)

مسلماناں بخویشاں در ستیزند — بجز نقشِ دوئی بردل نہ ریزند
بنالند ار کسے خشتے بگیرد — ازاں مسجد کہ خود ازوے گریزند

(مسلمان آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ اپنے دل پر نقش دوئی کے سوا کوئی نقش نہیں بنا رہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم شخص اس مسجد کی، جس کے وہ کبھی نزدیک تک نہیں گئے، ایک اینٹ بھی اکھاڑ لیتا ہے تو وہ چیخ اٹھتے ہیں۔)

اقبال مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کا ایک ایک ورق الٹ کر دیکھتے ہیں۔ اس میں ان کو جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن سے ایک مسلمان کا سر شرم و ندامت سے جھک جائے۔ بہت سی ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں جن کو نبوت محمدیؐ، اس کی تعلیمات، اس کی اعلیٰ قدروں اور اصولوں سے کوئی مناسبت نہیں۔ ان کو بہت سی مشرکانہ باتیں، غیر اللہ کی پرستش، جابر و ظالم بادشاہوں اور حکمرانوں کی خوشامد اور ان کی مدح سرائی کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں جن سے ایک غیور اور خوددار انسان کی پیشانی عرق آلود ہونے لگتی ہے۔ اقبال خاموشی کے ساتھ ایک ایک چیز دیکھتے جاتے ہیں اور آخر میں بڑی صراحت، بلاغت اور اختصار کے ساتھ کہتے ہیں کہ سچی بات تو یہ ہے کہ ان پستیوں کے ساتھ ہم ہرگز آپؐ کے شایانِ شان نہ تھے۔ ہمارا آپؐ کی ذات سے منسوب ہونا آپؐ کی شان میں بے ادبی ہے۔

جبیں را غیر اللہ سُودیم — چو گبراں در حضورِ او سرودیم
نالم از کسے، می نالم از خویش — کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

(ہم نے اپنی پیشانی کو غیر اللہ کی چوکھٹ پر گھسایا۔ اس کے حضور بت پرستوں اور آتش پرستوں کی طرح اس کی عظمت کے گیت گائے۔ میں کسی سے نالاں نہیں ہوں۔ اپنے آپ سے نالاں ہوں کہ ہم آپؐ کے شایانِ شان نہ تھے۔)

وہ عالم اسلام اور اسلامی ممالک پر احتیاطاً دوبارہ ایک نظر ڈالتے ہیں، اور اپنے جائزے کا حاصل یہ بتاتے ہیں کہ ایک طرف خانقاہوں کا سبو خالی ہے، دوسری طرف دانش گاہیں جدت و جرأت سے عاری ہیں۔ ان کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ طے کئے ہوئے سفر کو بار بار طے کرتی رہیں۔ ادب و شعر مردہ و بے روح اور دلی جذبات سے محروم ہیں۔

سبوئے خانقاہاں خالی ازمے — کند مکتب رہِ طے کردہ را طے
ز بزمِ شاعراں افسردہ رفتم — نواہا مُردہ بیروں اُفتد از نے

(خانقاہوں کے پیالے معرفت کی شراب سے خالی ہیں۔ دینی مدرسے اس راہ کو طے کر رہے ہیں جو پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔ میں آج کے شاعروں کی مجلس میں گیا اور بجھے ہوئے دل سے نکلا کیونکہ ان کی نوا مُردہ ہے۔)

وہ کہتے ہیں کہ میں نے دنیائے اسلام کا کونہ کونہ چھان مارا، لیکن وہ مسلمان مجھے نہ ملا جو موت سے لرزہ براندام ہونے کی بجائے موت اس سے لرزہ براندام ہو اور جو خود موت کے لئے پیامِ موت ہو۔

بآں بالے کہ بخشیدی پریدم — بسوزِ نغمہ ہائے خود تپیدم
مسلمانے کہ مرگ از وے بلرزد — جہاں گردیدم و اُو را ندیدم

(میں ان بال و پر سے اڑا جو تو نے عطا کئے ہیں۔ میں اپنے نغموں کے سوز میں تڑپا۔ میں سارا جہان گھوما ہوں، لیکن مجھے وہ مسلمان کہیں نظر نہیں آیا جس سے موت کانپتی ہے۔)

علامہ اقبال مسلمانوں کی پریشاں خاطری، آشفتہ سری اور تنزلی کا راز فاش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر وہ فرد یا جماعت جو دل تو رکھتی ہے لیکن دلبر نہیں رکھتی، محبت رکھتی ہے لیکن محبوب سے نا آشنا ہے وہ اطمینان اور دلجمعی سے ہمیشہ محروم رہتی ہے۔ اس کی تمام قوتیں ضائع ہوتی ہیں اور اس کی جدوجہد کبھی ایک منزل اور ایک مرکز پر قائم نہیں رہتی۔

شبے پیشِ خدا بگریستم زار — مسلماناں چرا زارند و خوارند
ندا آمد، نمیدانی کہ ایں قوم — دلے دارند و محبوبے ندارند

(میں ایک شب خدا کے سامنے بہت رویا کہ مسلمان کیوں زار و خوار ہیں۔ آواز آئی کہ کیا تو نہیں جانتا کہ یہ قوم دل تو رکھتی ہے لیکن محبوب نہیں رکھتی۔ یعنی اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ سے بالکل منقطع ہو گئی ہے۔)

لیکن ان تمام حوصلہ شکن حالات و مشکلات کے باوجود وہ مسلمانوں سے بددل اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں بلکہ اس مایوسی، افسردگی، دوسروں پر اعتماد کرنے اور ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کی تلقین کرنے والوں پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں اور بڑے درد

سے کہتے ہیں کہ حرم کے نگہبان بُت خانے کے پاسبان بن بیٹھے ہیں۔ ان کا یقین مُردہ و مضمحل اور ان کی نگاہ مستعار اور اغیار کی رہینِ منت ہے۔

نگہبانِ حرم معمارِ دیر است — یقینش مُردہ و چشمش بغیر است
ز اندازِ نگاہِ او تواں دید — کہ نومید از ہمہ اسباب خیر است

(وہ مسلمان جسے حرم کا محافظ ہونا چاہئے تھا' بت کدے کی تعمیر میں لگا ہوا ہے۔ اس کا یقین و ایمان مُردہ ہو چکا ہے اور اس کی نگاہ غیر اللہ پر لگی ہوئی ہے۔ اس کی نگاہ کے انداز سے دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ خیر و خوبی کے تمام اسباب سے ناامید ہو چکا ہے۔)

اقبال اپنا اور اپنے زمانے کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ برسرِ پیکار ہیں اور جو قدم قدم پر ان کے لئے ایک مستقل آزمائش اور امتحان ہے۔

گہے افتم ، گہے مستانہ خیزم — چہ خوں بے تیغ و شمشیرے بریزم
نگاہِ التفاتے بر سرِ بام — کہ من با عصرِ خویش اندر ستیزم

(کبھی میں گرتا ہوں اور کبھی مستانہ انداز میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ یہ کیا خون ہے جو میں بغیر تیغ و تلوار کے بہا رہا ہوں۔ مراد یہ ہے کہ میرے پاس قوت اور وسائل تو نہیں' لیکن پھر بھی میں اپنے بے دین زمانے کے خلاف لڑ رہا ہوں۔ اے محبوب! چھت پر سے ایک نگاہِ التفات مجھ پر ڈال کہ میں اپنے زمانے سے جنگ کر رہا ہوں۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی پوری زندگی عصرِ حاضر سے کشمکش میں گزری۔ انہوں نے مغربی تہذیب اور مادی فلسفے کا نہ صرف انکار کیا بلکہ آگے بڑھ کر اس پر سخت تنقید بھی کی۔ اس کو چیلنج کیا اور بڑی جرأت' روشن ضمیری اور گہرائی کے ساتھ اس کو کھوٹا ثابت کیا اور اس پردۂ فریب کو چاک کیا جس نے اس کی اصلی اور مکروہ شکل کو نگاہوں سے چھپا رکھا تھا۔ وہ حقیقت میں نئی نسل کے مربی' یقین و خود اعتمادی اور اسلامی شخصیت کے مکمل شعور کے حامل اور مادی بنیادوں اور مادی طرزِ فکر کے زبردست منکر تھے۔ ان کو یہ کہنے کا حق حاصل تھا کہ

چو رومی در حرم دادم اذاں من — ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او — بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

(میں نے جلال الدین رومی کی طرح حرم میں اذان دی۔ میں نے اس سے زندگی کے اسرار و رموز سیکھے۔ پرانے زمانے کے فتنے کے وقت وہ موجود تھے اور عصرِ حاضر کے فتنے کے وقت میں موجود ہوں۔)

مسلماں تا بساحل آرمید است — خجل از بحر و از خود ناامید است
جز ایں مردِ فقیرے دردمندے — جراحت ہائے پنہانش کہ دید است

(مسلمان جب سے عملی زندگی کے سمندر سے ہٹ کر ساحل پر آرام کرنے لگا ہے' سمندر سے شرمندہ اور اپنی ذات سے ناامید ہے۔ سوائے اس دردمند مردِ فقیر کے' اس کے خفیہ زخموں کی جراحت کا طریقہ کسے معلوم ہے۔ یعنی مسلمانوں کے دکھ درد کو جس طرح میں نے سمجھا ہے' اور اس کے زخموں کا علاج جس طرح میں نے کیا ہے' کوئی اور کیا کرے گا!)

اقبال مغربی تہذیب و علوم سے اپنی بغاوت' ان کے جال سے بچ نکلنے اور اپنے عقیدہ و ایمان اور اپنی روایات و اقدار کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے بڑا قلندرانہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے مغربی فلسفہ و تہذیب کے آتشِ نمرود میں شانِ ابراہیمی کا مظاہرہ کیا۔ وہ فخر و مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ انہوں نے ان علوم کا مغز حاصل کر لیا اور پوست پھینک دیا۔ یہی نہیں بلکہ کامیابی کے ساتھ اس کے جال سے باہر بھی آ گئے اور اس کا طلسم ہوشربا پاش پاش کر دیا' جس نے مشرق و مغرب دونوں کی نظر بندی کر رکھی ہے۔

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم — ربودم دانہ و دامش گسستم
خداداند کہ مانندِ براہیم — بہ نارِ او چہ بے پروا نشستم

(میں نے عصرِ حاضر کے علوم کا طلسم توڑا۔ میں نے اس کے جال سے دانہ تو چن لیا اور اس کا جال توڑ دیا۔ خدا جانتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح میں بھی موجودہ زمانے کی

دہریے کو کون سمجھائے!

نصر اللہ خاںؒ کے ایک قریبی دوست دہریہ ہو گئے۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے کر علامہ اقبال کے پاس پہنچے اور اُن سے کہا: "میرے یہ دوست خدا کے منکر ہیں۔ آپ ان کو سمجھائیں۔" اس پر علامہ نے مسکرا کر جواب دیا: "جس کو اللہ نہ سمجھا سکا ہو' اس کو بھلا میں کیا سمجھا سکوں گا!"

آگ میں بے پروا ہو کر بیٹھا۔)

وہ اپنی اس زندگی کا ذکر کرتے ہیں جو یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں گزری تھی اور جہاں خشک و افسردہ کتابوں' دقیق فلسفیانہ مباحث' فتنہ انگیز حسن و جمال اور دل آویز خوشنما مناظر کے سوا نہیں اور کچھ نہ مل سکا۔ اگر کوئی چیز ملی تو وہ خود فراموشی تھی' جس نے ان کو ان کے وجود سے بھی محروم کر دینا چاہا۔

بہ افرنگی بتاں دل باختم من — زتابِ دیریاں بگداختم من
چناں از خویشتن بیگانہ بودم — چو دیدم خویش را نشناختم من

(میں نے فرنگی بتوں کے پاس دل ہار دیا۔ میں بت پرستوں کی حرارت سے پگھل گیا۔ میں اپنے آپ سے اس قدر بیگانہ ہو گیا کہ جب میں نے خود کو دیکھا تو پہچان نہ سکا۔)

اب بھی جب ان کو یورپ کے قیام کے دن اور ان دنوں کی ویرانی و بے نوری یاد آتی ہے تو ان کی طبیعت پر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ کہتے ہیں کہ مے خانۂ مغرب میں بیٹھ کر مجھے سوائے دردِ سر کے' اور کچھ نہ ملا۔ اس سے زیادہ بے سوز' بے نور اور بے کیف شب و روز مجھے اپنی پوری عمر میں یاد نہیں' جو اِن دانشمندانِ فرنگ کے ساتھ گزرے۔

مے از میخانۂ مغرب چشیدم — بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی — ازاں بے سود تر روزے ندیدم!

(میں نے مغرب کے میخانے سے شراب پی۔ مجھے اپنی جان کی قسم میں نے دردِ سر مول لیا۔ میں یورپ کے فلسفیوں اور مدبروں کے ساتھ بیٹھا۔ میں نے اس سے بڑھ کر بے سوز و بے کیف دن نہیں دیکھے۔)

پھر بڑے درد کے ساتھ کہتے ہیں' میں تو آپؐ کے ایک فیضِ نگاہ کا پروردہ ہوں۔ اہلِ خرد اور اہلِ دانش کی یہ ساری نکتہ آفرینیاں اور لن ترانیاں میرے لئے دردِ سر کا سامان اور وبالِ جان ہیں۔ میں تو صرف آپؐ کے در کا فقیر ہوں۔ آپؐ کی گلی کا سائل ہوں۔ مجھے کسی کے سنگِ آستان پر سر پھوڑنے اور قسمت آزمانے کی کیا ضرورت ہے!

فقیرم از تو خواہم ہرچہ خواہم — دلِ کوہے خراش از برگِ کاہم
مرا درسِ حکیماں دردِ سر داد — کہ من پروردۂ فیضِ نگاہم!

(میں فقیر ہوں۔ میں جو کچھ چاہتا ہوں' آپؐ سے چاہتا ہوں۔ میں گھاس کا تنکا ہوں۔ اس سے پہاڑ کے دل میں خراش پیدا کر۔ مجھے اہلِ خرد و حکمت کے درس نے دردِ سر دیا' کیونکہ میں آپؐ کے فیضِ نگاہ کا پروردہ ہوں۔)

پھر اقبال اس طبقے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو دین اور علمِ دین کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس کی خشکی' جمود' محبت اور سوز دروں سے محرومی' معلومات کی گرم بازاری اور اصطلاحات کی گراں باری کا شکوہ کرتے ہوئے بڑے شاعرانہ اور بلیغ انداز میں کہتے ہیں کہ اس کا صحرائے حجاز زم زم سے خالی اور بیت اللہ سے محروم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حجاز کے ریگستان کی قیمت تو بیت اللہ اور آبِ زم زم سے ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو ان تپتے ہوئے بیابانوں اور خاموش پہاڑوں سے کیا فائدہ؟ اسی طرح وہ عالمِ دین کتنا مفلس و نادار ہے جو علمِ وافر' زبانِ گہر افشاں اور ذہنِ رساں کا مالک ہے' لیکن اس کی آنکھ محبت کے ایک آنسو اور دل کی ایک تڑپ سے بھی ناآشنا ہے' جس کے حصے میں اس سرزمینِ مقدس کی صرف سختی

اور گرمی آئی ہے' خنکی اور نمی نہیں آئی۔

دلِ مُلّا گرفتارِ غمے نیست　　نگاہے ہست در چشمش غمے نیست
ازاں بگریختم از مکتبِ او　　کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

(ملا غمِ عشق میں گرفتار نہیں ہے۔ اس کے پاس نگاہ تو ہے' لیکن آنکھ میں آنسو نہیں ہے۔ میں اس کے مکتب سے اس لئے بھاگا کیونکہ اس کے حجازی ریگ میں آبِ زم زم نہیں ہے۔ یعنی وہ دین کی باتیں تو ضرور کرتا ہے' لیکن اس میں خلوص اور سوز نہیں ہوتا۔)

وہ کہتے ہیں کہ ایک بار میں نے غیر اللہ پر بھروسا کیا اور اس کی سزا میں دو سو مرتبہ اپنے مقام سے نیچے گرایا گیا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں زورِ شمشیر کام آتا ہے نہ حسنِ تدبیر۔ یہ تقدیرِ الٰہی اور مشیت ایزدی کا مقام ہے اور یہاں قدم کی ایک لغزش آدمی کو بہت نیچے گرا سکتی ہے۔

دلِ خود را بدستِ کس ندادم　　گرہ از روئے کارِ خود کشادم
بہ غیر اللہ کردم تکیہ یک بار　　دو صد بار از مقامِ خود فتادم

(میں نے اپنا دل کسی کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ میں نے اپنے چہرے پر پڑی ہوئی گرہ کو خود کھولا۔ میں نے ایک بار غیر اللہ پر بھروسا کیا تھا۔ اس کی پاداش میں اپنے مقام سے دو سو مرتبہ گرایا گیا ہوں۔)

اقبال کہتے ہیں کہ اس بے سوز اور بے اخلاص عہد میں' جو منفعت و مصلحت کے سوا کسی اور چیز سے آشنا نہیں اور جس کا مصنوعی یا حیوانی دل ہر قسم کے لطیف احساسات اور مخلصانہ جذبات سے عاری ہے' میرے لئے سوزِ دروں کی آگ میں جلنے اور خونِ جگر پینے کے سوا اور کیا ہے۔

نگاہم زانچہ بینم بے نیاز است　　دل از سوزِ درونم در گداز است
من و ایں عصرِ بے اخلاص و بے سوز　　بگو با من کہ آخر ایں چہ راز است؟

(میری نگاہ جو کچھ ظاہر میں دیکھتی ہے' میں اس سے بے پروا ہوں۔ میرا دل میرے سوزِ دروں سے پگھلا ہوا ہے۔ میں ہوں اور یہ بے اخلاص اور بے سوز زمانہ۔ مجھے بتا' آخر یہ کیا راز ہے؟)

وہ کہتے ہیں' مشرق و مغرب کسی بھی جگہ میرا کوئی ہمدم و ہمراز نہیں۔ میں اپنا غمِ دل اپنے ہی دل سے کہتا ہوں اور اپنے آپ کو بہلاتا ہوں۔

من اندر مشرق و مغرب غریبم　　کہ از یارانِ محرم بے نصیبم
غمِ خود را بگویم بادلِ خویش　　چہ معصومانہ غربت را فریبم

(میں مشرق اور مغرب' ہر جگہ اجنبی ہوں۔ میں اپنے ہم دم و ہم ساز دوستوں سے بے نصیب ہوں۔ اپنا غم اپنے دل ہی سے کہتا ہوں۔ میں کس معصومیت سے اپنی اجنبیت کو فریب دے رہا ہوں۔)

اقبال کو شکایت یہ ہے کہ ان کی مخلصانہ نصیحتوں اور مشوروں پر کسی نے عمل نہیں کیا اور ان کے نخلِ علم کا کسی نے پھل نہ کھایا۔ انہوں نے شاعری میں جس سروشِ غیب کی ترجمانی کی' اس پر کسی نے کان نہ دھرا۔ سب ان کو ترجمانِ حقیقت کی بجائے محض غزل گو اور غزل خواں سمجھتے رہے۔

بآں رازے کہ گفتم' پے نبردند　　زشاخِ نخلِ من خُرما نخوردند
من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم　　مرا یارانِ غزل خوانے شمردند

(وہ راز جو میں نے مسلمانوں سے برملا کہہ دیا' اس پر وہ چلے نہیں۔ انہوں نے میرے کھجور کے درخت کا پھل نہیں کھایا۔ اے امیرِ امم حضرت محمد ﷺ! میں اپنے کلام و پیام کی تحسین حضور ﷺ سے چاہتا ہوں۔ میرے احباب نے تو مجھے محض غزل گو شاعر سمجھ رکھا ہے۔)

اقبال رسولِ کریم ﷺ سے شکایت کرتے ہیں کہ آپؐ کا حکم اور فرمان تو یہ ہے کہ میں لوگوں کو زندگی اور بقائے دوام کا پیغام پہنچاؤں' لیکن یہ ناحق شناس مجھ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ عام شاعروں کی طرح میں بھی لوگوں کی تاریخ وفات نکالتا اور قطعۂ تاریخ کہتا رہوں۔

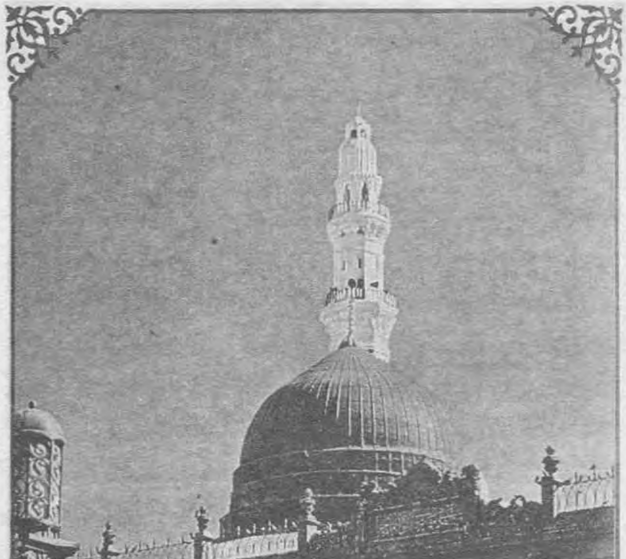

گنبدِ خضراء

تو گفتی از حیاتِ جاوداں گوئے　　بگوشِ مردۂ پیغامِ جاں گوئے
ولے گویند ایں ناحق شناساں　　کہ تاریخِ وفاتِ ایں و آں گوئے

(حضور ﷺ! آپ کا فرمان ہے کہ حیاتِ جاوداں کی بات کروں' مردہ دل لوگوں کے کان میں زندگی کا پیغام ڈال دوں' لیکن ناحق شناس لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ لوگوں کے مرنے پر تاریخ وفات کہا کرو' قطعۂ تاریخ لکھا کرو۔)

اقبال بڑے درد و سوز اور بڑی حسرت اور تلخی کے ساتھ اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ علم اور وہ پیغام جو ان کے اشعار کی روح اور اصل قیمت ہے' اس سے لوگوں کو دلچسپی نہیں۔ اس سلسلے میں لوگوں نے بڑی قناعت اور زہد کا ثبوت دیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اپنی ساری متاع کھول کر میں نے بازار میں رکھ دی' لیکن کوئی اس جنس نایاب کا خریدار نہ ملا۔ میں نے ارمغانِ دل پیش کرنا چاہا' لیکن اس کا بھی کوئی قدرداں نظر نہ آیا۔ مجھ سے زیادہ غریب الوطن' بیگانہ اور تنہا اس دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے۔

دلے برکف نہادم' دلبرے نیست　　متاعے داشتم' غارت گرے نیست
درونِ سینۂ من' منزلے گیر　　مسلمانے زمن تنہا ترے نیست

(یارسول اللہ ﷺ! میں نے اپنا دل اپنی ہتھیلی پر رکھا کہ ہے کوئی لے جانے والا' لیکن اس کو لے جانے والا کوئی نہیں۔ میرے پاس دولت تھی' لیکن میری دولت کو لوٹنے والا کوئی نہ تھا۔ یارسول اللہ ﷺ! آپ میرے سینے میں قیام فرمائیے۔ مسلمان ہوں' مجھ سے زیادہ تنہا اور کوئی نہیں ہے۔)

مؤمن

خودی، فقر اور عشق جس شخص میں جمع ہوں گے' وہ اقبالیات کی اصطلاح میں ''مؤمن'' کہلائے گا۔ اقبال اپنی ایک فارسی غزل میں ''مؤمن'' سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں: تجھ پر مجھے کمال حیرت ہے کہ آفاق تو تجھ سے روشن ہیں' لیکن تیری ذات ہی درمیان سے غائب ہے۔ تم کب تک غفلت' گمنامی و جہالت کی زندگی گزارتے رہو گے۔ تمہاری روشنی نے دنیائے قدیم کو روشن کیا اور تمہارا وجود ماضی کی تاریک رات کے لئے منارۂ نور بن کر رہا۔ تمہاری آستین میں ہمیشہ ید بیضا موجود رہا۔ تم آج گھروندوں میں گھوم رہے ہو' لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ تم انہیں پھلانگ بھی سکتے ہو۔ تم تو اس وقت بھی تھے جب یہ کائنات نہ تھی اور اس وقت بھی رہو گے' جب یہ نہ ہوگی۔ اے مردِ مؤمن! تو موت سے ڈرتا ہے' حالانکہ موت کو تجھ سے ڈرنا چاہئے۔ تمہیں جاننا چاہئے کہ آدمی کی موت روح کی جدائی سے نہیں ہوتی بلکہ ایمان کی کمی اور یقین سے محرومی کے باعث ہوتی ہے۔

اے مردِ مؤمن! تُو ناموسِ ازل کا امین و پاسباں' اور خدائے لم یزل کا رازداں ہے۔ تیرا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ تیری اٹھان مٹی سے ہے' لیکن تجھی سے اس عالم کا وجود و بقا متعلق ہے۔ میخانۂ یقیں سے پی اور ظن و تخمین کی پستیوں سے نکل کر بلند ہو جا۔ فرنگ کی دل آویزی کی نہ داد ہے نہ فریاد' جس نے عقل و دل دونوں کو مسحور و مخمور اور ناکارہ بنا دیا ہے۔ فریاد ان بازی گروں سے جو کبھی ناز و ادا سے پکڑتے ہیں اور کبھی بیڑیوں میں جکڑتے ہیں' کبھی شیریں کا کردار ادا کرتے ہیں اور کبھی پرویز کا روپ بھرتے ہیں۔ دنیا ان کی تباہ کاریوں سے ویران ہوگئی ہے۔

اے مردِ مؤمن! اے بانیٔ حرم! اے معمارِ کعبہ! اے فرزندِ ابراہیم! ایک بار پھر دنیا کی تعمیر کے لئے اٹھ اور اپنی گہری نیند سے بیدار ہو۔

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز
کاشانۂ ما رفت بتاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغ چمن' از بانگِ اذاں خیز
از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز!
از خوابِ گراں' خوابِ گراں' خوابِ گراں خیز!

''مؤمن'' سے متعلق اردو اشعار کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

بندۂ مؤمن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے!
(بانگِ درا: سید کی لوحِ تربت)

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقیں محکم' عمل پیہم' محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
(بانگِ درا: طلوعِ اسلام)

عالم ہے فقط مؤمن جانباز کی میراث
مؤمن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے
(بالِ جبریل: غزل 10)

کافر ہے مسلماں' تو نہ شاہی نہ فقیری
مؤمن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مؤمن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں
مؤمن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی
(بالِ جبریل، غزل 12)

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک
تُو بے بصر ہو تو یہ مانعِ نگاہ بھی ہے
وگرنہ آگ ہے مؤمن' جہاں خس و خاشاک
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک
جہاں تمام ہے میراث' مردِ مؤمن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک
(بالِ جبریل، غزل 46)

نہ مؤمن ہے نہ مؤمن کی امیری
رہا صوفی ' گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری
(بالِ جبریل: رباعی)

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مؤمن کا راز
اس کے دنوں کی تپش' اس کے شبوں کا گداز
اس کا مقامِ بلند' اس کا خیالِ عظیم
اس کا سرور' اس کا شوق' اس کا نیاز' اس کا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا' بندۂ مؤمن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں' کارکشا' کارساز
خاکی و نوری نہاد' بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی' اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل' اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب' اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو ' گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو' پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق' مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ' عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ
(بالِ جبریل: مسجد قرطبہ)

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے
جنہیں تُو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دونیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ' ان کی ہیبت سے رائی
دوعالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

مینڈک اور شب بیداری

میکلوڈ روڈ والی جس کوٹھی میں علامہ رہائش پذیر تھے' اس کے پچھواڑے میں ایک میدان تھا جس میں اکثر پانی بھرا رہتا اور مینڈک ساری رات ٹرا ٹرا کر سونا حرام کر دیتے۔ جاوید اقبال کی والدہ نے علامہ سے اس کی شکایت کی تو آپ ہنس پڑے اور فرمانے لگے: "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لوگ شب بیداری کے لئے کیا کیا جتن کرتے ہیں' لیکن آپ کے لئے تو قدرت نے خود ہی انتظام کر دیا ہے۔ اس لئے مینڈکوں کو برا بھلا کہنے کی بجائے اللہ اللہ کیجئے۔"

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے

یہ سحر جو کبھی فردا ہے، کبھی ہے امروز
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
کہتے ہیں فرشتے کہ دلآویز ہے مومن

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
فطرت کا سرودِ ازلی اس کے شب و روز
بنتے ہیں مری کارگہِ فکر میں انجم

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام
اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر
تقدیر کے پابند نباتات و جمادات

پرورش دل کی اگر مدنظر ہے تجھ کو

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
تقدیرِ اُمم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا

مقامِ بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی

حدیثِ بندۂ مومن دل آویز!
میسر ہو کسے دیدار اس کا

گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب

نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے
(بالِ جبریل: طارق کی دعا)
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں
اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں
(بالِ جبریل: ایک نوجوان کے نام)
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا
(ضربِ کلیم: صبح)
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے
مومن!
(ضربِ کلیم: مومن)
گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن
دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمٰن
لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان
(ضربِ کلیم: مردِ مسلمان)
یہ مسئلہ مشکل نہیں، اے مردِ خردمند
ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند
(ضربِ کلیم: احکامِ الٰہی)
مردِ مومن کی نگاہِ غلط انداز ہے بس
(ضربِ کلیم: محرابِ گل افغان کے افکار)
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ
(ارمغانِ حجاز: بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو)
زمین سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
نہ تیرہ خاکِ لحد ہے، نہ جلوہ گاہِ صفات
(ارمغانِ حجاز: مسعود مرحوم)
جگر پُرخون، نفس روشن، نگہ تیز
کہ ہے وہ رونقِ محفل کم آمیز
(ارمغانِ حجاز: رباعی)
دیں بندۂ مومن کے لئے موت ہے یا خواب
(ارمغانِ حجاز: ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض)

علامہ اقبال، مسجد قرطبہ میں نماز ادا کرتے ہوئے

بقیہ: مغربی تعلیم

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب

زجاج گر کی دکاں شاعری و ملائی
کسے خبر کہ جنوں میں کمال اور بھی ہیں
ہجومِ مدرسہ بھی سازگار ہے اس کو

اے شیخ بہت اچھی مکتب کی فضا لیکن
صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا

ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر
(ضربِ کلیم: نصیحت)
ستم ہے خوار پھرے دشت و در میں دیوانہ
کریں اگر اسے کوہ و کمر سے بیگانہ
کہ اس کے واسطے لازم نہیں ہے ویرانہ
(ضربِ کلیم: جنوں)
بنتی ہے بیاباں میں فاروقی و سلمانی
تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانی
(ضربِ کلیم: غزل 20)

شاہین

اقبال کے ہاں مردِ مومن' نوجوان' فرزندِ کہستانی' نئی نسل یا نژادِ نو کا ایک اور نام بھی ہے اور وہ ہے ''شاہین'' بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اقبال نے اپنے کلام میں اپنے مثالی نوجوان کو عموماً شاہین کہہ کر پکارا ہے۔ اس لئے کہ ایک مثالی نوجوان میں اقبال جس قسم کے اوصاف دیکھنے کے آرزومند ہیں' وہ انہیں شاہین میں نظر آتے ہیں۔ اقبال نے خود ایک جگہ بیان کیا ہے کہ ''شاہین کی تشبیہہ محض شاعرانہ تشبیہہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ خوددار و غیرت مند ہے' کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا' بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ بلند پرواز ہے' خلوت پسند ہے اور تیز نگاہ ہے۔ چنانچہ اقبال نے جگہ جگہ شاہین (جرہ شاہیں' شاہینِ کافوری' باز' جرہ باز اور عقاب وغیرہ) کی صفات کا ذکر کیا ہے' لیکن اس ذکر سے اُن کی مراد نوجوانوں ہی کی سیرت و کردار سے ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے — کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے — مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے
(بانگِ درا: طلوعِ اسلام)

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں — کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی
(بالِ جبریل: غزل 10)

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں — اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی
(بالِ جبریل: غزل 13)

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے — سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا
بہت مدت کے نخچیروں کا اندازِ نگہ بدلا — کہ میں نے فاش کر ڈالا' طریقہ شاہبازی کا
(بالِ جبریل: غزل 8)

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر — یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کُلاہ
(بالِ جبریل: غزل 23)

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا — یہ اک مردِ تن آساں تھا' تن آسانوں کے کام آیا
اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں — بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا
(بالِ جبریل: غزل 35)

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر — چمن اور بھی' آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تُو شاہیں ہے' پرواز ہے کام تیرا — تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
(بالِ جبریل: غزل 40)

ترا جوہر ہے نُوری' پاک ہے تُو — فروغِ دیدۂ افلاک ہے تُو
ترے صیدِ زبوں فرشتہ و حور — کہ شاہینِ شہ لولاکؐ ہے تُو
(بالِ جبریل: رباعی)

جوانوں کو مری آہِ سحر دے — پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے — مرا نورِ بصیرت عام کر دے
(بالِ جبریل: رباعی)

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے' مٹا دو
(بالِ جبریل: فرمانِ خدا)

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر — تو شاہیں ہے' بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
(بالِ جبریل: ایک نوجوان کے نام)

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقابِ سالخورد — اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام — سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر — وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں
(بالِ جبریل: نصیحت)

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور
(بالِ جبریل: حال و مقام)

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تُو — دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
(بالِ جبریل: ابوالعلامعرّی)

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارہ — جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو — ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ
نہ بادِ بہاری' نہ گلچیں' نہ بلبل — نہ بیماریٔ نغمۂ عاشقانہ
خیابانوں سے ہے پرہیز لازم — ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری — جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں — کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا' پلٹنا' پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب' یہ پچھم' چکوروں کی دنیا — مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں — کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ
(بالِ جبریل: شاہین)

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا — پُردم ہے اگر تُو تو نہیں خطرۂ افتاد
(ضربِ کلیم: اسرارِ پیدا)

بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے — پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال — کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
(ضربِ کلیم: ہندی مکتب)

ہیں کارِ جہاں سے نہیں آگاہ' ولیکن — اربابِ نظر سے نہیں پوشیدہ کوئی راز
کر تُو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد — دستور نیا اور نئے دور کا آغاز

(باقی صفحہ 44 پر)

علم و عقل

علم اور چیز ہے تعلیم اور چیز ہے۔ اقبال علم وحکمت وعقل کے مدمقابل یا ان سے بھی بالاتر عشق کو خیال کرتے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ علم کو عشق کے تابع خیال کرتے ہیں۔ وہ معرفت اور عرفان کے قائل ہیں اور حصولِ علم کا مقصد بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ عالم کو عرفانِ ذات حاصل ہو جائے۔

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے　　تُو خدا جُو' خدانما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی　　اس مُرض کی مگر دوا ہوں میں
(بانگِ درا: عقل ودل)

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن' گوہر بدست　　وائے محرومی! خزف چیں لبِ ساحل ہوں میں
(بانگ درا: غزل)

ہر مسلماں رگِ باطل کے لئے نشتر تھا　　اس کے آئینہ ہستی میں عمل جوہر تھا
جو بھروسا تھا اسے' قوتِ بازو پر تھا　　ہے تمہیں موت کا ڈر' اس کو خدا کا ڈر تھا
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو!
(بانگ درا: جواب شکوہ)

ولایت' پادشاہی' علم اشیا کی جہاں گیری　　یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا' مگر مشکل سے ہوتی ہے　　ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہے تصویریں
(بانگ درا: طلوعِ اسلام)

عشق کی تیغِ جگردار اڑا لی کس نے؟　　علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات　　ہو نہ روشن' تو سخن مرگِ دوام اے ساقی
(بال جبریل: غزل 8)

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب　　آنکھ کا نور' دل کا نور نہیں
علم میں بھی سرور ہے لیکن　　یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں
(بال جبریل: غزل 20)

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل　　اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل
(بال جبریل: غزل 42)

یہ علم' یہ حکمت' یہ تدبر' یہ حکومت　　پیتے ہیں لہو' دیتے ہیں تعلیم مساوات
(بال جبریل: لینن "خدا کے حضور میں")

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں　　علمِ حاضر سے ہے دیں زار و زبوں
علم را برتن زنی مارے بود　　علم را بر دل زنی یارے بود
(بال جبریل: پیر ومرید)

علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ؟　　کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟

علم و حکمت زاید از نانِ حلال　　عشق و رقت آید از نانِ حلال
(بال جبریل: پیر ومرید)

شہیدِ محبت نہ کافر نہ غازی　　محبت کی رسمیں نہ ترکی' نہ تازی
وہ کچھ اور شے ہے' محبت نہیں ہے　　سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی
یہ جوہر اگر کارفرما نہیں ہے　　تو ہیں علم وحکمت فقط شیشہ بازی
(بال جبریل: محبت)

علم نے مجھ سے کہا' عشق ہے دیوانہ پن　　عشق نے مجھ سے کہا' علم ہے تخمین وظن
بندۂ تخمین وظن' کرمِ کتابی نہ بن　　عشق سراپا حضور' علم سراپا حجاب
(بال جبریل: علم وعشق)

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی　　نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم!
وہ علم' کم بصری جس میں ہمکنار نہیں　　تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم
(ضرب کلیم: علم اور دین)

زندگی کچھ اور شے ہے' علم ہے کچھ اور شے　　زندگی سوزِ جگر ہے' علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے' قدرت بھی ہے' لذت بھی ہے　　ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
(ضرب کلیم: تربیت)

وہ علم نہیں' زہر ہے احرار کے حق میں　　جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کف جو
ناداں! ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے　　اسبابِ ہنر کے لئے لازم ہے تگ و دو
فطرت کے نوامیس پہ غالب ہے ہنرمند　　شام اس کی ہے مانند سحر صاحبِ پرتو
(ضرب کلیم: محراب گل افغان کے افکار)

یہ علم' یہ حکمت' یہ سیاست' یہ تجارت　　جو کچھ ہے' وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد
اللہ! ترا شکر کہ یہ خطۂ پُرسوز　　سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد
(ارمغان حجاز: دوزخی کی مناجات)

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمز آشکارا　　زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بے کرانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی　　عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ
(ارمغانِ حجاز: ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض)

کارہائے نمایاں!

ایک دفعہ طلبہ نے طویل گفتگو کے بعد آخر میں یہ سوال پوچھا: "آپ کو نوبل پرائز کیوں نہیں ملا؟" علامہ نے مسکرا کر جواب دیا: "اگر مجھے نوبل پرائز مل چکا ہوتا تو پھر آپ مجھ سے یہ سوال کرتے کہ مجھے کون سے کارہائے نمایاں سرانجام دینے پر اس اعزاز کا مستحق سمجھا گیا۔"

مغربی تعلیم

اقبال جدید مغربی تعلیم کے سخت خلاف ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تعلیم ہمارے نوجوانوں میں تعطل، جمود، آرام طلبی اور لذت کوشی پیدا کرتی ہے اور زندگی کو بحرِ منجمد بنا دیتی ہے۔ جدید تعلیم مغربی استعمار کا ہتھکنڈا بن کر مشرق میں اس کی تہذیب، اس کے افکار اور اس کے مستقبل کے لئے نوآبادیات کی زمین ہموار کرتی ہے اور نوجوانوں کو مغرب زدہ بناتی ہے اور بلند معیارِ زندگی اور اقتصادی ترقی کی ہوس پیدا کر کے نئے نئے مسائل سامنے لاتی ہے۔ مغربی تعلیم کفر و الحاد پھیلاتی ہے۔ ذہنی انتشار اور فکری الجھاؤ کا باعث ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کا وجود اس کا ذاتی وجود نہیں، بلکہ وہ یورپ (اور اب امریکہ) کی پرچھائیں ہے اور اس کی مصنوعی زندگی بھی مستعار ہے۔ نئی نسل جسم و مادہ کا وہ ڈھانچا ہے جسے مغربی معماروں نے تعمیر کیا ہے، لیکن اس میں روح نہیں ہے۔ نئی نسل کی نگاہ میں خدا کا وجود معدوم ہے، اور یہ اسلامی طرزِ فکر و تعلم کی نفی ہے۔ اسلام کا جوہر ذاتِ باری تعالیٰ بلکہ اس کی توحید میں ہے۔ اگر ہمارے نوجوانوں کی تعلیم سے یہ نکتۂ توحید ہی خارج کر دیا جائے تو انسان محض مٹی کا پیکر رہ جاتا ہے۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں
ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
(بانگِ درا: سید کی لوحِ تربت)

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
(بانگِ درا: تعلیم اور اس کے نتائج)

سرشد کی یہ تعلیم تھی، اے مسلمِ شوریدہ سر
لازم ہے رہرو کے لئے دنیا میں سامانِ سفر
اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا
ہے خونِ فاسد کے لئے تعلیم مثلِ نیشتر
رہبر کے ایما سے ہوا تعلیم کا سودا مجھے
واجب ہے صحرا گرد پر تعمیلِ فرمانِ خضر
رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد
(بانگِ درا: مسلمان اور تعلیمِ جدید)

تعلیم پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستیِ غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش
محسوس پر بناء ہے علومِ جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام
ہے جس سے آدمی کے تخیل کو انتعاش
باہر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ہرچند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش
(بانگِ درا: مذہب)

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں؟
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر
تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں
ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل
کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر
تعلیم اس کو چاہئے ترکِ جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسانواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر
(ضربِ کلیم: جہاد)

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے، کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اُس جنوں سے تجھے تعلیم نے کیا بیگانہ
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیضِ فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوتِ کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش
(ضربِ کلیم: مدرسہ)

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مُردہ لادینیِ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیِ افکار سے مشرق میں غلام
(ضربِ کلیم: عصرِ حاضر)

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تُو
کتاب خواں ہے، مگر صاحبِ کتاب نہیں
(ضربِ کلیم: طالب علم)

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار
کیا مدرسہ، کیا مدرسہ والوں کی تگ و دو
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو
(ضربِ کلیم: اساتذہ)

ملے گا منزلِ مقصود کا اسی کو سراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ
میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حُر کے لئے جہاں میں فراغ
کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ
(ضربِ کلیم: غزل)

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعویٰ نظر لاف و گزاف
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف
(ضربِ کلیم: دین و تعلیم)

جوہر میں ہو لا إلٰہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ
(ضربِ کلیم: جاوید سے)

(باقی صفحہ 39 پر)

مغربی تہذیب

مغرب کی مادی تہذیب اور اس کی پیدا کردہ مشکلات اور مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبال اپنی تصنیف "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" میں لکھتے ہیں:

"حاصلِ کلام یہ کہ عصرِ حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ہیں' ان کے زیرِ اثر انسان کی روح مُردہ ہو چکی ہے' یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھیے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے۔ سیاسی اعتبار سے نظر ڈالئے تو افراد افراد سے دست و گریباں ہیں۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور نا قابلِ تسکین ہوسِ زر پر قابو حاصل کر سکے۔ یہ باتیں ہیں جن کے زیرِ اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب واقدار کے لئے مغربی تہذیب کی جدوجہد بتدریج ختم ہو رہی ہے۔

بہر حال یہ وطنیت ہو یا لادینی اشتراکیت' دونوں مجبور ہیں کہ ہر کسی کو نفرت' بدگمانی اور غم و غصے پر اکسائیں' حالانکہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر مُردہ ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سرچشمے تک پہنچ سکے۔ جب تک انسان کو اپنے آغاز و انجام کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی' وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آ سکتا جس میں باہمی مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی مہیب اور غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے' نہ اس تہذیب وتمدن پر جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے۔"

دیارِ مغرب میں رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو' وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہو گا

(بانگ درا: مارچ 1907ء)

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی
کیا ذرہ کو جگنو دے کے تابِ مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتابِ جلوہ فرما کی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی' یہ بیداری' یہ آزادی' یہ بے باکی
تغیر آ گیا ایسا تدبر میں' تخیل میں
ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
کیا گم تازہ پروانوں نے اپنا آشیاں لیکن
مناظر دل کشا دکھلا گئی ساحر کی چالاکی
حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت' خودفروشی' ناشکیبائی' ہوس ناکی
فروغِ شمعِ نو سے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی
مگر کہتی ہے پروانوں سے' میری کہنہ ادراکی
"تو اے پروانہ! ایں گرمی زِ شمعِ محفلے داری
چو من در آتشِ خود سوز' اگر سوزِ دلے داری"

(بانگِ درا: تہذیبِ حاضر)

نسل' قومیت' کلیسا' سلطنت' تہذیب' رنگ
"خواجگی" نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لئے
شکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

(بانگ درا: خضرِ راہ)

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انسانی کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

جب تک انسان کو اپنے آغاز وانجام کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی' وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آ سکتا جس میں باہمی مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی مہیب اور غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے' نہ اس تہذیب وتمدن پر جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے۔

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے' جنت بھی' جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

(بانگِ درا: طلوعِ اسلام)

کچھ غم نہیں جو حضرتِ واعظ ہیں تنگ دست
تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
ردِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا
تردیدِ حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

(بانگ درا: ظریفانہ)

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ
دفعِ مرض کے واسطے پل پیش کیجئے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

(بانگ درا: ظریفانہ)

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الیکشن' ممبری' کونسل' صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے

(بانگ درا: ظریفانہ)

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا
دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سُروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا
فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیِ خارا

(بالِ جبریل: نادر شاہ غازی)

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں — کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری
مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی — کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری
تُو اے مولائے یثربؐ آپ میری چارہ سازی کر — مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری
(بال جبریل غزل 14)

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش — اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش
کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام — مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدت سے خموش
میں نے پایا ہے اسے اشک سحرگاہی میں! — جس دُرِ ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش
نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں — چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش
صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے — گاہے گاہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش
(بال جبریل غزل 56)

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے — حرم کا راز توحید امم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب — کہ تہذیب فرنگی بے حرم ہے
(بال جبریل: رباعی)

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو
تہذیب نو کارگہِ شیشہ گراں ہے — آدابِ جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو
(بال جبریل: فرمان خدا فرشتوں سے)

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دُوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی — دُوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی — کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری
(بال جبریل: دین و سیاست)

زمانے کے انداز بدلے گئے — نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ — کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے — زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا!
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش — مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن، تصوف، شریعت، کلام — بُتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ امت روایات میں کھو گئی
(بال جبریل: ساقی نامہ)

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیرِ پاک و خیالِ بلند و ذوقِ لطیف
(ضرب کلیم: مغربی تہذیب)

یہ عیش فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت — دل سینۂ بے نور میں محرومِ تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے — یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ — شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی
(ضرب کلیم: یورپ اور یہود)

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر — ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال — غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش
اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ — روما نے کر دیا سرِ بازار پاش پاش
پیرِ کلیسا! یہ حقیقت ہے دل خراش
(ضرب کلیم: ابی سینیا)

کہاں فرشتۂ تہذیب کی ضرورت ہے — نہیں زمانۂ حاضر کو اس میں دشواری
جہاں قمار نہیں، زن تنک لباس نہیں — جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ مے خواری
(ضرب کلیم: انتداب)

جو بات حق ہو، وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی — خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر
مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں — کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمِ آزاد — فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر
متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی — تو ہیں ہراولِ لشکر کلیسا کے سفیر
(ضرب کلیم: لادین سیاست)

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے — ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار
یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے — بجلی کے چراغوں سے منور کئے افکار
جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل — تدبیر سے کھلتا نہیں، یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ "جفا پیشہ" کے پنجے سے نکل کر — بے چارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار
(ضرب کلیم: دامِ تہذیب)

دیکھیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق — میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ — سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہُو
(ارمغان حجاز: ابلیس "اپنے مشیروں سے")

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت — ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا
دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش — تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا — ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
(ارمغان حجاز: بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو)

بقیہ: شاہین

معلوم نہیں ہے یہ خوشامد کہ حقیقت — کہہ دے کوئی اُلو کو اگر "رات کا شہباز"
(ضرب کلیم: خوشامد)

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پَر — شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر
لیکن اے شہباز! یہ مرغانِ صحرا کے اچھوت — ہیں فضائے نیلگوں کے پیچ و خم سے بے خبر
ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام — روح ہے جس کی دمِ پرواز سر تا پا نظر
(ضرب کلیم: محراب گل افغان کے افکار)

زاغ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ — کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
(ارمغان حجاز: ابلیس کی مجلس شوریٰ)

ضرورت رشتہ

ماسٹر ڈگری یافتہ، برطانوی شہریت کی حامل **24** سالہ لڑکی کے لئے دینی گھرانے سے رشتہ مطلوب ہے۔ ترجیحاً ڈاکٹر، کمپیوٹر انجینئر۔ لڑکے کا قد **5** فٹ **6** انچ سے زائد نہ ہو جبکہ عمر تیس سال سے کم نہ ہو۔

رابطہ فون نمبر: **7449287**

اسلام: نشأۃ ثانیہ

نشأۃ کا مطلب ہے: اُگنا' ظاہر ہونا' پیدا ہونا۔

نشأۃِ ثانیہ کا مطلب ہے: دوبارہ سے ظاہر ہونا' دوبارہ جی اٹھنا' دوبارہ عروج۔

اسلامی نشأۃ ثانیہ کا مطلب ہے: اسلام کا دوبارہ عروج۔ موجودہ زوال اور پستی سے نکل کر دوبارہ وہی عروج حاصل کرنا جو ظہورِ اسلام کے بعد ابتدائی چند صدیوں میں اسلام کو پوری دنیا میں حاصل تھا۔

تنظیم اسلامی کے بانی مبانی محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے ایک مضمون ''اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید وتعمیل'' میں لکھا ہے: ''قرآن حکیم سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے اور رسول کریم ﷺ کی احادیث میں تو صراحت کے ساتھ اس کی خبر دی گئی ہے کہ قیامت سے قبل ایک بار پھر اللہ کا دین اللہ کی زمین پر اسی شان کے ساتھ غالب ہوگا' جس شان سے چودہ سو سال قبل ہوا تھا' اور اس بار دینِ اسلام کا غلبہ پورے کرۂ ارض کو محیط ہوگا اور پورا عالمِ انسانی توحید کے نُور سے منور ہو جائے گا۔ علامہ اقبال نے اس نُور کی جھلک دکھاتے ہوئے فرمایا تھا:

آسماں ہوگا سحر کے نُور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
پھر دِلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے — یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

قرآن مجید میں تین بار یعنی سورۂ توبہ کی آیت 33' سورۃ الفتح کی آیت 28 اور سورۃ الصف کی آیت 9 میں یہ فرمایا گیا:

﴿هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

''وہی ہے اللہ' جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کرے اُسے کُل دین یا تمام ادیان (مذاہب) پر۔''

گویا نبی کریم ﷺ کی آمد و بعثت کا مقصد ''دین حق کا غلبہ'' ہے' اور دوسری طرف مختلف اسلوبوں سے تین ہی بار یہ فرمایا کہ آنحضور ﷺ کی بعثت تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ جیسے سورۂ سبا کی آیت 28 میں فرمایا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾

''ہم نے نہیں بھیجا آپ کو' مگر تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر۔''

یوں دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی خلافت عالمی' آفاقی اور پورے عالمِ انسانی اور کرۂ ارضی کو محیط ہے۔

اس کی صریح پیشین گوئیاں بھی صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ چنانچہ مسند احمد بن حنبلؒ میں حضرت مقداد بن اسودؓ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''روئے ارضی پر کوئی ایک گھر بھی ایسا نہیں بچے گا' خواہ وہ اینٹ گارے کا بنا ہوا ہو یا کمبلوں کے خیمے کی صورت میں ہو' جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کر دے' چاہے کسی عزت والے کے اعزاز کے ساتھ یا پھر کسی پست ہمت کے ضعف کے ذریعے (یعنی یا تو گھر والا خود ایمان لے آئے گا یا اسے اسلام کی بالادستی قبول کرنی ہوگی!)۔'' اس پر حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا: تب تو وہی بات پوری ہو جائے گی کہ کُل دین اللہ ہی کے لئے ہو جائے! (اشارہ ہے سورۃ الانفال کی آیت 39 کی جانب)

محترم ڈاکٹر اسرار احمد قرآن وحدیث کے ان حوالوں کے ساتھ جب ''برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید وتعمیل'' پر اظہارِ رائے کرتے ہیں تو نتیجہ علامہ اقبال کے حق میں نکالتے ہیں: ''اب حالیہ تاریخ پر نظر ڈالئے تو صاف نظر آئے گا کہ بیسویں صدی عیسوی ''احیائے اسلام'' کی جدوجہد کی صدی ہے۔ چنانچہ اس کے آغاز کے ساتھ ہی وہ عمل بھی شروع ہو گیا تھا جسے اسلام اور اُمتِ مسلمہ کے ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جو اِس صدی کے رُبعِ اوّل کے خاتمے کے بعد تو پوری شدت اختیار کر گیا تھا ...... تقریباً پون صدی پر پھیلی ہوئی اس تاریخ میں اہم ترین اور جامع ترین شخصیت علامہ اقبال کی ہے۔ اُن کے بارے میں جس قدر غور کیا جائے' حیرت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اُن کی یہ ''جامعیت'' حیرت انگیز ہے کہ وہ واحد رہنما ہیں جو بیک وقت قومی اور احیائی دونوں محاذوں پر اس درجہ سرگرم عمل رہے کہ اگر ایک جانب وہ فکرِ اسلامی کے مجدّد ہیں (''الٰہیات اسلامیہ کی تشکیلِ جدید'' اُن کے خطبات کا عنوان ہے) تو دوسری جانب تصورِ پاکستان کے خالق اور نظریۂ پاکستان کے ''مُوجد'' بھی ہیں۔ اسی طرح وہ داعی الی القرآن بھی ہیں اور حکیم الامت بھی۔ جہاں تک قرآن کے فلسفہ وحکمت کے بحرِ عمیق میں غواصی کا تعلق ہے تو اس میدان میں تو وہ بالکل تنہا ہیں اور اُن کا کوئی دوسرا شریک یا مثیل ہے ہی نہیں''۔

علامہ اقبال کی یہ ''جامعیت'' حیرت انگیز ہے کہ وہ واحد رہنما ہیں جو بیک وقت قومی اور احیائی دونوں محاذوں پر اس درجہ سرگرم عمل رہے کہ اگر ایک جانب وہ فکرِ اسلامی کے مجدّد ہیں تو دوسری جانب تصورِ پاکستان کے خالق اور نظریۂ پاکستان کے ''مُوجد'' بھی ہیں۔ اسی طرح وہ داعی الی القرآن بھی ہیں اور حکیم الاُمت بھی۔ جہاں تک قرآن کے فلسفہ وحکمت کے بحرِ عمیق میں غواصی کا تعلق ہے تو اس میدان میں تو وہ بالکل تنہا ہیں اور اُن کا کوئی دوسرا شریک یا مثیل ہے ہی نہیں۔

''جس طرح ڈیڑھ دو صدی قبل شاہ ولی اللہ دہلوی کی دُور رس نگاہ نے بقول اقبال ''ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی'' کے لئے احمد شاہ ابدالی کا انتخاب کیا تھا اور اسے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی' صرف اُسی طرح نہیں بلکہ اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر حضرت علامہ اقبال کی عقابی نگاہ نے ایک جانب لندن میں جا بسنے والے محمد علی جناح کو ''قومی ناخدا'' کی حیثیت سے معین کیا اور خود انہیں اِس پہلو سے ''خودشناسی'' کا جوہر عطا کیا' اور دوسری جانب حیدرآباد دکن میں مقیم ابوالاعلیٰ مودودی کو ''متکلم اسلام'' ہونے کا اہل سمجھا اور

اُنہیں اس خطے میں منتقل ہونے کی دعوت دی جس کے بارے میں اُن کی چشمِ باطن اور نگاہِ دُور بین دیکھ چکی تھی کہ وہاں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام "تقدیرِ الٰہی" ہے۔"

آج جبکہ پندرھویں صدی ہجری کا سورج طلوع ہوئے 23 برس ہو چکے ہیں' ہمیں چاروں طرف تمام اسلامی ممالک میں ایک اضطراب اور زوال کی کیفیت دکھائی دے رہی ہے۔ کہیں پاکستان اور بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر ہے' کہیں مسلمانوں اور اسرائیل کے درمیان بیت المقدس کا مسئلہ ہے' کہیں چیچنیا کے مسلمان' کہیں یورپ کے قلب میں بوسنیا کے مسلمان اپنے دین کی سرفرازی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ 11 ستمبر 2001ء کو امریکا کے "ٹریڈ سنٹر" کے انہدام کے بعد تو صدر بش نے صاف ہی کہہ دیا: "صلیبی جنگ کا آغاز ہو چکا ہے"۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس نے سیاسی مصلحتوں کے تحت مسلمانانِ عالم سے معذرت کا اظہار کیا۔ امریکا کے ایک بڑے عیسائی پادری نے حال ہی میں بیان دیا ہے کہ "پیغمبرِ اسلام دہشت گرد تھے" (نعوذ باللہ)۔ مسلمانانِ عالم کے زوال کی نشانی اس سے بڑی کیا ہو سکتی ہے کہ ایسے شرمناک بیانات پر اُن کی اجتماعی تنظیم "اسلامی سربراہ کانفرنس" (او آئی سی) ایک معمولی قرارداد بھی منظور نہ کر سکی۔ یہ کوئی علاقائی اور اقتصادی جنگ نہیں' بلکہ ایک نظریاتی اور مذہبی جنگ ہے۔ افغانستان میں روس کی جارحیت اور اب امریکا کی شہ' یہ جارحیت' عراق پر امریکی جارحیت اور اس کے بعد پورے عالمِ اسلام کے لئے مغرب کا جارحانہ چیلنج اور مسلمان ملکوں کی بے بسی اور بے چارگی علامہ اقبال ایسے مجدد کو آواز دے رہی ہے۔

عصرِ حاضر میں ملتِ اسلامیہ کے درمیان اضطراب واجتہاد کی تحریک کے محرک مفکر اسلام علامہ اقبال ہیں جن کی دُور رس نگاہ نے آنے والے دَور یعنی عصرِ رواں کی عکاسی ایک پیش گوئی کی صورت میں "جوابِ شکوہ" میں پہلے ہی سے کر دی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک روز عالمِ اسلام کا چمن خونِ شہداء کی لالی سے گلزار بن جائے گا اور جب بہار آئے گی تو گلستانِ اسلام ہر قسم کے خس وخاشاک سے خالی ہو جائے گا اور یہ پیش گوئی اُس وقت صحیح ثابت ہو گی جبکہ عالمِ اسلام کے آسمان کا رنگ عنابی ہو گا۔ اسلامی ممالک کی موجودہ زبوں حالی کا نقشہ علامہ نے اپنی نظم "بلادِ اسلامیہ" میں یوں پیش کیا ہے:

سرزمینِ دلی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے ذرے ذرے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے
پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں
سوتے ہیں اس خاک میں خیرالامم کے تاجدار نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیِ محفل کی یاد
جل چکا حاصل' مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہان آباد بھی اس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
یہ چمن وہ ہے کہ تھا جس کے لئے سامانِ ناز لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز
خاک اس بستی کی ہو کیوں کر نہ ہمدوشِ ارم جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبرؐ کے قدم

جس کے غنچے تھے چمن ساماں' وہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما' ان کا مدفن ہے یہی

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی

قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے
جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگ نمناک ہے

خطۂ قسطنطنیہ' یعنی قیصر کا دیار مہدیؑ امت کی سطوت کا نشانِ پایدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمیں بھی پاک ہے آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا تربتِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا

گوند کا درخت اور نیک بخت

نواب زادہ خورشید علی لاہور کے مشہور سیاست دان تھے۔ ابھی وہ چھوٹے سے تھے اور دن بھر یوکلپٹس کے درختوں سے گوند کھرچ کھرچ کر نکالتے رہتے تھے۔ جب علامہ اقبال اُن کے قریب سے گزرتے تو پوچھتے: "چھوٹے میاں کیا کر رہے ہو؟" وہ کہتے "گوند نکال رہا ہوں"۔ اس پر آپ فرماتے:

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے

یہ مصرع سن کر نواب زادہ کہتے: "بس آپ کی شاعری ایک ہی مصرعے پر آ کر ختم ہو گئی ہے"۔ اس کے بعد جب علامہ دوبارہ وہاں گئے اور چھوٹے میاں کو بدستور گوند کھرچتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور ہو گی ان کی شادی کسی نیک بخت سے

اے مسلماں ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر
سینکڑوں صدیوں کی کشت وخوں کا حاصل ہے یہ شہر

وہ زمیں ہے تو' مگر اے خواب گاہِ مصطفیٰ دید ہے کعبے کی تیری حجِ اکبر سے سوا
خاتمِ ہستی میں تُو تاباں ہے مانندِ نگیں اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں
تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی
نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے جانشیں قیصر کے' وارث مسندِ جم کے ہوئے
ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام ہند ہی بنیاد ہے اس کی' نہ فارس ہے نہ شام
آہ! یثرب! دیس ہے مسلم کا تو' ماویٰ ہے تُو نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تُو

جب تلک باقی ہے تُو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

علامہ اقبال نے جون 1912ء میں ایک نظم "مسلم" کے عنوان سے تخلیق کی تھی' جس میں انہوں نے مسلمانانِ عالم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

ہم نشیں! مسلم ہوں میں' توحید کا حامل ہوں میں اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں
نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا
دہر میں غارت گرِ باطل پرستی میں ہوا حق تو یہ ہے حافظِ ناموسِ ہستی میں ہوا
میری ہستی پیرہن عریانیِ عالم کی ہے میرے مٹ جانے سے رُسوائی بنی آدم کی ہے
قسمتِ عالم کا مسلم کوکبِ تابندہ ہے جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے
آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات کہہ نہیں سکتے مجھے نومیدِ پیکارِ حیات
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار
ہاں یہ سچ ہے' چشم بر عہدِ کہن رہتا ہوں میں اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اُس دورِ نشاط افزا کو میں دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

"حضور رسالت مآبؐ میں" کے عنوان سے اپنی نظم میں اقبال سرورِ کائنات' محسنِ انسانیت ﷺ کی خدمت میں اپنی حاضری کو یوں بیان کرتے ہیں:

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
قیودِ شام وسحر میں بسر تو کی لیکن نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا

فرشتے بزمِ رسالتؐ میں لے گئے مجھکو
حضورِ آیۂ رحمتؐ میں لے گئے مجھکو

کہا حضورؐ نے، اے عندلیبِ باغِ حجاز!
کلی کلی ہے تری گرمیِ نوا سے گداز
ہمیشہ سرخوشِ جامِ ولا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرتِ سجودِ نیاز
اڑا جو پستیِ دنیا سے تو سوئے گردوں
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تُو آیا؟

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں اقبال نذرانے کے طور پر ایک آبگینہ پیش کرتے ہیں، جس میں ایک ایسی چیز ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی اور جس سے اُمتِ مسلمہ کی آبرو جھلکتی ہے، یعنی طرابلس کے شہیدوں کا لہو۔ طرابلس تو ایک علامت ہے، ورنہ اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں اللہ کی راہ میں مسلمان شہادت گاہِ اُلفت میں اپنا لہو بہاتے ہیں، وہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ نے (اقبال کی زبان ہی سے سہی) ''جوابِ شکوہ'' میں مسلمانوں کو بیدار ہونے کی تلقین کی ہے اور اقوامِ عالم میں مسلمانوں کو جو فضیلت حاصل ہے، اُس کی یاد دلائی ہے۔ ''جوابِ شکوہ'' ایک طویل نظم ہے، اُس کے چند آخری بند یہ ہیں، جن میں عصرِ حاضر کی آفتوں اور سختیوں کے باوجود دیگر اقوامِ عالم پر مسلمانوں کی برتری کا اظہار کیا گیا ہے۔

عہدِ نَو برق ہے، آتش زنِ ہر خرمن ہے
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے
ملتِ ختمِ رسلؐ شعلہ بہ پیراہن ہے
آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

امتیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں
اور محرومِ ثمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی ہیں
سینکڑوں نخل ہیں، کاہیدہ بھی بالیدہ بھی ہیں
سینکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں
نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تُو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا
غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا
نخلِ شمع استی و در شعلہ دود ریشۂ تو
عاقبت سوز بود سایۂ اندیشۂ تو

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

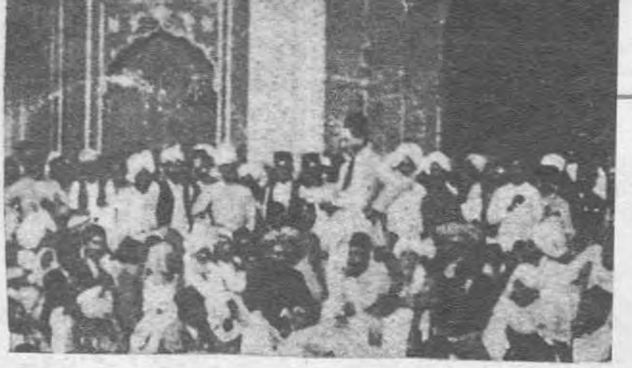

ایک یادگار تصویر

شاہی مسجد لاہور میں علامہ اقبال جنگِ طرابلس کے موقع پر اپنی مشہور نظم پڑھ رہے ہیں۔

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری
وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مثلِ بُو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا
رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرّے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوّتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے
بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے
چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعنَا لَکَ ذِکرَکَ دیکھے

مردمِ چشمِ زمیں، یعنی وہ کالی دنیا
وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمیِ مہر کی پروردہ ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

پھر اقبال تمام نوجوانانِ ملت کے عالمگیر ترانے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کاش اس ''ترانۂ ملی'' کا منظوم ترجمہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں اور بالخصوص اسلامی ملکوں کی قومی زبانوں میں ہو جائے!

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا، نام و نشاں ہمارا

دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا ہم اُس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا
تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا
مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا
باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم سو بار کر چکا ہے تُو امتحاں ہمارا
اے گلستانِ اندلس! وہ دن ہیں یاد تجھ کو تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا
اے موجِ دجلہ! تُو بھی پہچانتی ہے ہم کو اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
اے ارضِ پاک! تیری حُرمت پہ کٹ مرے ہم ہے خوں تری رگوں میں اب تک رواں ہمارا
سالارِ کارواں ہے میرِ حجازؐ اپنا اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

جب ملت اسلامیہ کا کارواں پھر سے جادہ پیما ہونے لگتا ہے تو دنیا کے تمام نوجوانانِ اسلام ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے حضور مجسم ''دعا'' بن جاتے ہیں۔

یا رب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے
پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکا دے پھر شوقِ تماشا دے، پھر ذوقِ تقاضا دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے
پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلا دے
اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے
رفعت میں مقاصد کو ہم دوشِ ثریا کر خودداریٔ ساحل دے، آزادیٔ دریا دے
بے لوث محبت ہو بے باک صداقت ہو سینوں میں اجالا کر، دل صورتِ مینا دے
احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

نوجوانوں کا قافلۂ ہمت و جراًت جب قدم بڑھاتا ہے تو اقبال ''ضربِ کلیم'' میں ''قُم باذن اللہ'' کے زیرِ عنوان اُن سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے، قُم باذن اللہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے، قُم باذن اللہ
کیا نوائے اناالحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے، قُم باذن اللہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے، قُم باذن اللہ

اسی طرح فرمایا۔

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے، تُو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی، خاک میں اس بُت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی رہ بحر میں آزادِ وطن، صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن، سنتِ محبوبِ الٰہیؐ دے تُو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

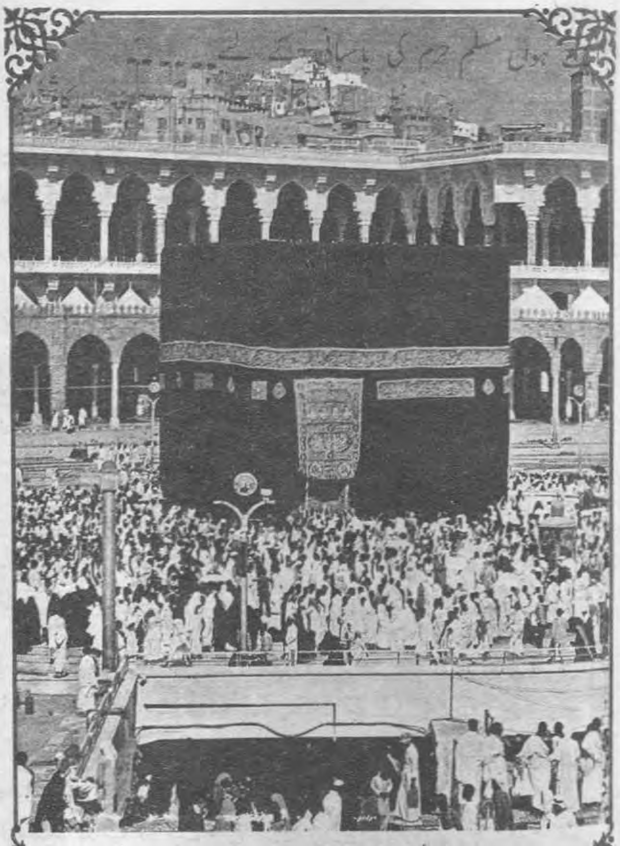
حجاج کرام خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے۔

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں، وطن اور ہی کچھ ہے

(بانگ درا: وطنیت)

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز
لے رہا ہے مے فروشانِ فرنگستان سے پارس وہ مئے سرکش، حرارت جس کی ہے مینا گداز
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو مضطرب ہے تُو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز
ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و بُو، مٹ جائے گا ترک خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر
نسل اگر مسلم کی، مذہب پر مقدم ہو گئی اڑ گیا دنیا سے تُو مانندِ خاکِ رہ گزر
تا خلافت کی بِنا، دنیا میں ہو پھر استوار لا کہیں سے ڈھونڈ کر، اسلاف کا قلب و جگر

(بانگ درا: خضرِ راہ)

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مُردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

ایک انتہائی جامع دعا

یکے از

مناجاتِ رسول ﷺ

اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ مَعَاصِیْكَ، وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهٖ جَنَّتَكَ، وَمِنَ الْیَقِیْنِ مَاتُهَوِّنُ بِهٖ عَلَیْنَا مَصَائِبَ الدُّنْیَا، اَللّٰھُمَّ مَتِّعْنَا بِاَسْمَاعِنَا، وَاَبْصَارِنَا، وَقُوَّاتِنَا مَا اَحْیَیْتَنَا، وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا، وَاجْعَلْ ثَأْرَنَا عَلٰی مَنْ ظَلَمَنَا، وَانْصُرْنَا عَلٰی مَنْ عَادَانَا، وَلَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا، وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ هَمِّنَا، وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا، وَلَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَا یَرْحَمُنَا

(الترمذی ۵/۵۲۸ والحاکم ۱/۲۵۸)

''اے اللہ! ہمیں اپنی ذات کا اتنا خوف اور تقویٰ عطا فرما دیں جسے آپ ہمارے اور اپنی نافرمانیوں کے درمیان دیوار بنا دیں- اور ہمیں اپنی اتنی اطاعت کرنے کی توفیق دے دیں جس کے طفیل آپ ہمیں جنت میں پہنچا دیں- اور اتنا کامل یقین عطا فرما دیں جس کے ذریعے آپ دنیا کی ہر مشکل ہم پر آسان فرما دیں- اے اللہ! جب تک آپ ہمیں زندہ رکھیں ہمیں سننے، دیکھنے اور دیگر جسمانی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی مہلت بھی عطا کر دیں- اور آخری سانس تک یہ صلاحیتیں ہمارا ساتھ دیں- اور ہم اپنا بدلہ اسی سے چکائیں جس نے ہم پر ظلم کیا ہو- اور جو ہم پر زیادتی کرے اس کے مقابلے میں ہماری مدد فرما- اے اللہ! دین کے معاملے میں ہمیں امتحان میں نہ ڈال دینا! اور دنیا کو ہماری سب سے بڑی آرزو اور ہمارے علم کی انتہا مت بنا دینا--- اور ہم پر کسی ایسے شخص کو مسلط نہ کر دینا جو ہم پر رحم نہ کرے-'' .... آمین، ثم آمین!

طالب دعا ــــــ ایک بندۂ خدا

اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
''نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی''
سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل سے ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے
(بانگِ درا: طلوعِ اسلام)

روح اسلام کی ہے نورِ خودی' نارِ خودی
زندگانی کے لئے نارِ خودی نور و حضور
یہی ہر چیز کی تقویم' یہی اصلِ نمود
گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظ ''اسلام'' سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے ''فقرِ غیور''
(ضربِ کلیم: اسلام)

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے' وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں' بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد
اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد!
مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو' وہ اسلام کر ایجاد
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد
(ضربِ کلیم: ہندی اسلام)

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں
طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بے زاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے' نہیں ہے طلسمِ افلاطوں
عناصر اس کے ہیں' روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حُسنِ طبیعت' عرب کا سوزِ دروں
(ضربِ کلیم: مدنیتِ اسلام)

میں نہ عارف' نہ مجدّد' نہ محدّث' نہ فقیہہ
مجھ کو معلوم نہیں' کیا ہے نبوّت کا مقام
ہاں مگر عالمِ اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام
عصرِ حاضر کی شبِ تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تمام
وہ نبوّت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں' قوت و شوکت کا پیام
(ضربِ کلیم: نبوّت)

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی' وحدتِ آدم
تفریقِ ملل' حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود' فقط ملّتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟
(ضربِ کلیم: مکہ اور جنیوا)

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے ہے خالی
فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام
بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں
قبولِ دینِ مسیحی سے برہمن کا مقام
اگر قبول کرے دینِ مصطفیٰ انگریز!
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام
(ضربِ کلیم: اشاعتِ اسلام فرنگستان میں)

پانی بھی مسخر ہے' ہوا بھی ہے مسخر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے
(ضربِ کلیم: جمعیت اقوامِ مشرق)

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا' شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن' مرد آزما' مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں' نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
ہے یہی بہتر' الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے
(ارمغانِ حجاز: ابلیس ''اپنے مشیروں سے'')

چوزہ بریگیڈ

علامہ اقبال کی بیگم (والدہ جاوید) کو مرغیاں پالنے کا بڑا شوق تھا اور اکثر مرغی سے چوزے نکلوایا کرتی تھیں۔ چوزے نکلنے سے گھر کی رونق میں کافی اضافہ ہو جاتا تھا۔ مرغی اپنے بچوں کی فوج کو لئے سارے گھر میں گھومتی رہتی۔ علامہ اقبال اسے ''چوزہ بریگیڈ'' کہا کرتے تھے اور اگر کبھی مرغی اپنے بچوں سمیت علامہ کے کمرے میں داخل ہو جاتی تو فوراً اپنے ملازم علی بخش کو آواز دیتے: ''علی بخش! چوزہ بریگیڈ کی ڈیوٹی کسی دوسری طرف لگاؤ''۔

بقیہ : خودی

بتوں سے کعبہ کو آباد رکھنا کام ہے اپنا
ہنسی جس کی اڑائے کفر وہ اسلام ہے اپنا
محبت میں بتوں کی شیخ نے اسلام ہارا ہے
جو سلکِ سبحہ لازم ہو' اُسے زنار پیارا ہے
سفیدی نے سروں کی ہے بنایا پیر پیروں کو
ملا موقع ہنسی کا ہر گلی کوچہ کے بچوں کو
ہوئے ہیں لا اِلٰـــہ کے نقش سے دل اُن کے بیگانے
ہوس کی مورتوں سے ہو گئے آباد بُت خانے
ہوا ہر مُو دراز اب طاق طرزِ خرقہ پوشی میں
کیا ہے نام ان سوداگروں نے دیں فروشی میں
سفر میں رات دن رہتے ہیں ساتھ اپنے مریدوں کے
وہ ہیں ناآشنا ملت کی ہر ادنیٰ ضرورت سے
نہیں ہے نور کوئی مثلِ نرگس اُن کی آنکھوں میں

دلِ زندہ کی دولت کی کمی ہے اُن کے سینوں میں
مگن منصب پرستی میں ہوئے سب واعظ و صوفی
نہیں ہے اعتبار اب ملتِ بیضا کا کچھ باقی
لگی ہے آنکھ واعظ کی صنم خانے کے منظر پر
بنا ہے مفتیٔ دینِ مبیں فتووں کا سوداگر
کیا ہے رخ ہمارے پیر نے میخانے کا سیدھا
بتاؤ ہمدمو تم ہی کہ ہو تدبیر اپنی کیا؟

دخترانِ ملت کے نام

دخترانِ ملت کے لئے اقبال وہی طرزِ حیات پسند کرتے ہیں جو قرونِ اولیٰ میں مسلمان خواتین میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت عورتیں مروجہ برقع کے نہ ہوتے ہوئے بھی شرم و حیا اور احساس عفت و عصمت میں مثالی نمونہ تھیں' اور شرعی پردے کے اہتمام کے ساتھ ساتھ زندگی کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں۔

اقبال کو اُن شاعروں اور فن کاروں سے شکایت تھی جو عورت کے نام کا غلط استعمال کر کے ادب کی پاکیزگی' بلندی اور مقصدیت کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔ وہ اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں۔

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند   کرتے ہیں روح کو خوابیدہ' بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس   آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اقبال دنیا کی سرگرمیوں کی اصل ''ماؤں'' کی ذات کو قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی ذات امین ممکنات اور انقلاب انگیز مضمرات کی حامل ہے اور جو قومیں ماؤں کی قدر نہیں کرتیں' ان کا نظامِ زندگی سنبھل نہیں سکتا۔

وہ آزادئ نسواں کی تحریک کے اس لئے حامی نہیں کہ اس کا نتیجہ دوسرے انداز میں عورتوں کی غلامی ہے۔ اس سے خواتین کی مشکلات آسان نہیں' مزید پیچیدہ ہو جائیں گی اور انسانیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جذبۂ امومت ختم ہو جائے گا' ماں کی ممتا کی روایت کمزور پڑ جائے گی۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ جس علم سے عورت اپنی فطری خصوصیات کھو دیتی ہے' وہ علم نہیں بلکہ موت ہے اور مغربی تہذیب اقوامِ عالم کو اسی موت کی دعوت دے رہی ہے۔

علامہ اقبال حضرت فاطمہ زہراؓ کو ملتِ اسلامیہ کی خواتین کے لئے ''مثالی خاتون'' سمجھتے ہیں اور جگہ جگہ ان کے اتباع کی تاکید کرتے ہیں' کہ وہ کس طرح چکی پیستے ہوئے بھی قرآن مجید پڑھتی رہتی تھیں اور گھریلو کاموں میں مشکیزہ تک اٹھانے پر صبر فرماتی تھیں۔ اقبال کے خیال میں سیرت کی اسی پختگی سے حضرات حسنینؓ ان کی آغوش سے نکلے۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ   مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ
آں ادب پروردۂ صبر و رضا   آسیا گرداں و لب قرآں سرا
فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند   چشمِ ہوش از اسوۂ زہراؓ بلند
تا حسینےؓ شاخِ تو بار آورد   موسمِ پیشیں بہ گلزار آورد
اگر پندے ز درویشے پذیری   ہزار امت بمیری تو نہ میری
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر   کہ در آغوش شبیرےؓ بگیری!

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی   ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِنظر   وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟   پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ
(بانگ درا: ظریفانہ)

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا   مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں   گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور   کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں
(ضرب کلیم: مردِ فرنگ)

کوئی پوچھے حکیمِ یورپ سے   ہند و یونان ہیں جس کے حلقہ بگوش!
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال   مرد بیکار و زن تہی آغوش
(ضرب کلیم: ایک سوال)

بہت رنگ بدلے سپہرِ بریں نے   خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے
تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے   وہ خلوت نشیں ہے یہ خلوت نشیں ہے
ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم   کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے!
(ضرب کلیم: پردہ)

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے   روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے   ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے   وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر ولیکن   خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر
(ضرب کلیم: خلوت)

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ   اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی   کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن   اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں
(ضرب کلیم: عورت)

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا   گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے' وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب   پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں' تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش   مجبور ہیں' معذور ہیں' مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ   آزادئ نسواں کہ زمرد کا گلوبند؟
(ضرب کلیم: آزادئ نسواں)

اِک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور   کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم' نئی ہو کہ پرانی   نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا   اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد
(ضرب کلیم: عورت کی حفاظت)

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت   ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن   کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن   ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت
(ضرب کلیم: عورت اور تعلیم)

نونہالانِ ملت کے نام

نئی نسل یا نژادِ نو سے اقبال کے گہرے تعلق کا اندازہ ان نظموں سے بھی کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے بچوں کے لئے کہی ہیں۔ یہ نظمیں گویا اس عظیم پیغام کی تمہید ہیں جو اقبال نئی نسل کو دینا چاہتے تھے اس لئے کہ ان میں نئی نسل کی سیرت و کردار سازی کے لئے قریب قریب وہی روش اختیار کی گئی ہے جس پر چل کر اپنی خودی کو استوار و مستحکم کیا جاسکتا ہے۔

''ایک مکڑی اور مکھی'' کے عنوان کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ خوشامد میں آنا گویا جان سے ہاتھ دھونا ہے۔ ''پہاڑ اور گلہری'' میں یہ بات بچوں کے ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ حقیقی بڑائی کا تعلق قد و قامت سے نہیں' بلکہ حرکت و عمل سے ہے۔ ''ایک گائے اور بکری'' والی نظم میں اس بات کا اشارہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کا وجود ساری مخلوق کے لئے باعثِ رحمت ہے۔ ''بچے کی دُعا'' تعمیرِ سیرت کے سلسلے میں ایک لاثانی دعا ہے۔ چھوٹے بڑے' عورت مرد بوڑھے جوان سب کو زبانی یاد ہے اور اس کا اثر سب کے دلوں پر نقش ہے۔ ''ہمدردی'' والی نظم صرف یہی نہیں کہ ہمدردی کا درس دیتی ہے بلکہ ظلمت کو روشنی اور بدی کو نیکی میں بدل دینے کا عزم و حوصلہ بخشتی ہے۔

اقبال نے ان نظموں میں بڑا سادہ اور سلیس طرزِ تخاطب اختیار کیا ہے۔ بچوں کی نصیحت آموزی کے لئے چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیوں کو آسان اور خوبصورت نظموں میں پیش کیا گیا ہے۔ بچوں کو اخلاقی تعلیم دینے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا ہے! یہی وجہ ہے کہ بچوں کے لئے اقبال کی یہ چند نظمیں بھی بہت مقبول ہوئی ہیں۔

ایک مکڑا اور مکھی

ایک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا
اس راہ سے ہوتا ہے گزر روز تمہارا
لیکن میری کٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت
بھولے سے کبھی تم نے یہاں پاؤں نہ رکھا
غیروں سے نہ ملئے تو کوئی بات نہیں ہے
اپنوں سے مگر چاہئے یوں کھنچ کے نہ رہنا
آؤ جو مرے گھر میں تو عزت ہے یہ میری
وہ سامنے سیڑھی ہے جو منظور ہو آنا
مکھی نے سنی بات جو مکڑے کی تو بولی
حضرت! کسی نادان کو دیجئے گا یہ دھوکا
اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا' پھر نہیں اترا

مکڑے نے کہا: واہ! فریبی مجھے سمجھے
تم سا کوئی نادان زمانے میں نہ ہوگا
منظور تمہاری مجھے خاطر تھی' وگرنہ
کچھ فائدہ اپنا تو مرا اس میں نہیں تھا
اڑتی ہوئی آئی ہو خدا جانے کہاں سے
ٹھیرو جو مرے گھر میں تو ہے اس میں برا کیا؟
اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں
باہر سے نظر آتا ہے چھوٹی سی یہ کٹیا
لٹکے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے
دیواروں کو آئینوں سے ہے میں نے سجایا
مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے
ہر شخص کو ساماں یہ میسر نہیں ہوتا
مکھی نے کہا: خیر! یہ سب ٹھیک ہے لیکن
میں آپ کے گھر آؤں' یہ امید نہ رکھنا
ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے
سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا

مکڑے نے کہا دل میں' سنی بات جو اس کی
پھانسوں اسے کس طرح یہ کمبخت ہے دانا
سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا
یہ سوچ کے مکھی سے کہا اس نے' بڑی بی
اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رتبا
ہوتی ہے اسے آپ کی صورت سے محبت
ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا
آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں
سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا

یہ حسن' یہ پوشاک' یہ خوبی' یہ صفائی!
پھر اس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گانا
مکھی نے سنی جب یہ خوشامد تو پسیجی
بولی کہ نہیں آپ سے مجھ کو کوئی کھٹکا
انکار کی عادت کو سمجھتی ہوں برا میں
سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا
یہ بات کہی اور اڑی اپنی جگہ سے
پاس آئی تو مکڑے نے اچھل کر اسے پکڑا
بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی
آرام سے گھر بیٹھ کے مکھی کو اڑایا

(بانگ درا)

ایک پہاڑ اور گلہری

(ماخوذ از ایمرسن)

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے
ذرا سی چیز ہے' اس پر غرور! کیا کہنا
یہ عقل اور یہ سمجھ' یہ شعور! کیا کہنا!
خدا کی شان ہے ناچیز چیز بن بیٹھیں
جو بے شعور ہوں یوں باتمیز بن بیٹھیں
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے
جو بات مجھ میں ہے' تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں! جانور غریب کہاں
کہا یہ سن کے گلہری نے' منہ سنبھال ذرا
یہ کچی باتیں ہیں دل سے انہیں نکال ذرا
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
نہیں ہے تُو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا' کوئی چھوٹا' یہ اُس کی حکمت ہے
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ کو
نری بڑائی ہے' خوبی ہے اور کیا تجھ میں
جو تُو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا' مجھ کو
نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

(بانگ درا)

ایک گائے اور بکری

(ماخوذ)

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں
تھی سراپا بہار جس کی زمیں
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں
تھے اناروں کے بے شمار درخت
اور پیپل کے سایہ دار درخت

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں　　طائروں کی صدائیں آتی تھیں
کسی ندی کے پاس اک بکری　　چرتے چرتے کہیں سے آ نکلی
جب ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا　　پاس اک گائے کو کھڑے پایا
پہلے جھک کر اسے سلام کیا　　پھر سلیقے سے یوں کلام کیا
کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں!　　گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں
کٹ رہی ہے بری بھلی اپنی　　ہے مصیبت میں زندگی اپنی
جان پر آ بنی ہے' کیا کہیے　　اپنی قسمت بری ہے' کیا کہیے
دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں　　رو رہی ہوں بُروں کی جان کو میں
زور چلتا نہیں غریبوں کا　　پیش آیا لکھا نصیبوں کا
آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے　　اس سے پالا پڑے' خدا نہ کرے!
دودھ کم دوں تو بڑبڑاتا ہے　　ہوں جو دُبلی' تو بیچ کھاتا ہے
ہتھکنڈوں سے غلام کرتا ہے!　　کن فریبوں سے رام کرتا ہے!

اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں　　دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں
بدلے نیکی کے یہ برائی ہے　　میرے اللہ! تری دہائی ہے!!
سن کے بکری یہ ماجرا سارا　　بولی' ایسا گلہ نہیں اچھا
بات سچی ہے بے مزا لگتی　　میں کہوں گی مگر خدا لگتی
یہ چراگہ' یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا　　یہ ہری گھاس اور یہ سایا
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں!　　یہ کہاں' بے زباں غریب کہاں!
یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں　　لطف سارے اسی کے دم سے ہیں
اس کے دم سے ہے اپنی آبادی　　قید ہم کو بھلی' کہ آزادی؟
سو طرح کا بنوں میں ہے کھٹکا　　واں کی گزران سے بچائے خدا
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا　　ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا
قدر آرام کی اگر سمجھو　　آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو
گائے سن کر یہ بات شرمائی　　آدمی کے گِلے سے پچھتائی
دل میں پرکھا بھلا برا اس نے　　اور کچھ سوچ کر کہا اس نے

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی!

(بانگ درا)

بچے کی دعا

(ماخوذ)

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری　　زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دُور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے　　ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب　　علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا　　دردمندوں سے' ضعیفوں سے محبت کرنا

مرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو' اس رہ پہ چلانا مجھ کو

(بانگ درا)

ہمدردی

(ماخوذ از ولیم کوپر)

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا　　بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی　　اُڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک　　ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سن کر بلبل کی آہ و زاری　　جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے　　کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری　　میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل　　چمکا کے مجھے دیا بنایا

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

(بانگ درا)

النصر لیب

مستند اور تجربہ کار ڈاکٹروں کی زیرنگرانی ادارہ

ایک ہی چھت کے نیچے تمام اقسام کے معیاری لیبارٹری ٹیسٹ' ایکسرے' ای سی جی اور الٹرا ساؤنڈ کی سہولیات

محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی نگاہ میں قابلِ اعتماد ادارہ

خصوصی پیکج

مکمل میڈیکل چیک اپ یعنی ☆ ایکسرے چیسٹ ☆ الٹرا ساؤنڈ ☆ ای سی جی ☆ ہارٹ ☆ لیور ☆ کڈنی ☆ جوڑوں سے متعلق متعدد ٹیسٹ ☆ ہیپاٹائٹس بی اور سی ☆ بلڈ گروپ ☆ بلڈ شوگر ☆ مکمل بلڈ اور مکمل پیشاب ٹیسٹ صرف 1500 روپے میں کروائیں

تنظیم اسلامی کے رفقاء اور ندائے خلافت کے قارئین اپنا ڈسکاؤنٹ کارڈ لیبارٹری سے حاصل کریں۔

ISO 9001:2000
QMS CERTIFIED
CLINICAL LAB
BY MOODY INTERNATIONAL

النصر لیب: 950۔بی' مولانا شوکت علی روڈ' فیصل ٹاؤن (نزد راوی ریسٹورنٹ) لاہور
فون: 516285-5163924 موبائل: 0300-8400944
E-mail: alnasar@brain.net.pk www.alnasar.com.pk

پیام بذریعہ جاوید

وہ بے شمار باتیں جو اقبال اپنے عہد کے نوجوان کے متعلق خود اس سے یا دوسروں سے کہنا چاہتے ہیں' ان کی شاعری کے مختلف ادوار میں ان کے مختلف مجموعہ ہائے کلام میں بکھری اور پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان باتوں میں نہ باہم کوئی منطقی ربط ہے اور نہ تقدم و تاخر کا کوئی تعلق۔ اس کے باوجود کہ یہ سب خیالات داخلی طور پر ایک مضبوط منطقی اور فکری رشتے میں منسلک ہیں' وہ جب شعر کی صورت اختیار کرتے ہیں تو ربط اور تعلق کے یہ رشتے قائم نہیں رہتے۔ ہر خیال خیالوں کی اس زنجیر سے الگ ہو کر' جس میں فکر اور جذبے کی داخلی سطح پردہ حلقہ بند ہے' ایک کڑی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور شعر میں اپنے واضح وجود کا الگ اعلان کرتا ہے۔ اقبال کے جن شعروں اور نظموں کا اب تک تجزیہ کیا گیا' ان میں بات تو کوئی بھی ایسی نہیں جو اقبال کے منظم فلسفۂ حیات کا جزو' عنصر یا حصہ نہ ہو' لیکن یہ سب باتیں اس منظم فلسفے کے منفرد اور منتشر اجزا اور عناصر ہی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان میں تقدم و تاخر اور سبب اور نتیجے کا منطقی تعلق خود ہمارا ذہن پیدا کرتا ہے۔

لیکن اقبال کی چار نظمیں ایسی ہیں جن میں انہوں نے براہ راست اپنے فرزند جاوید کا نام لے کر اسے مخاطب کیا ہے' اور ظاہر ہے کہ یہاں جاوید سے مراد جاوید اقبال نہیں' بلکہ جاوید کے پردے میں ہر مسلم نوجوان ہے۔ ان چاروں نظموں میں نوجوانانِ اسلام کے نام اقبال کا پیغام ایک منطقی ربط بھی رکھتا ہے اور راست گفتگو کا اندازِ تخاطب بھی۔ صرف دو مقامات ایسے ہیں جہاں جاوید کا نام اقبال کے فرزند کی حیثیت سے آیا ہے' نہ کہ عام نوجوانانِ اسلام کی حیثیت سے۔ یہ دو مقامات ''ارمغان حجاز'' (فارسی) کی دو رباعیوں میں ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

سحر جاوید را در سجدہ دیدم — بہ صبحش چہرہ شامم بیارائے

(میں نے صبح کے وقت اپنے بیٹے جاوید کو سجدہ ریز دیکھا۔ اس کی صبح سے میری شام کے چہرے کو زینت دے۔ یعنی میں تو آخری عمر کو پہنچ گیا ہوں جبکہ جاوید کی زندگی کا آغاز ہے' خدا کرے وہ میرے سرمایۂ فکر و عمل کا وارث بن جائے۔)

ایک اور رباعی میں اقبال رسول کریم ﷺ سے جاوید کے لئے دعا کرتے ہیں۔

ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید — زعشقِ تو بگیرد رنگ و بُوئے

ظاہر ہے کہ علامہ اقبال جس طرح اپنے پیارے فرزند کو عشقِ رسولؐ میں سرشار دیکھنا چاہتے تھے' اسی طرح ہر مسلم نوجوان کو بھی آنحضور ﷺ کے رنگ و بُو میں بسا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

''جاوید کے نام''

پہلی نظم کا عنوان ''جاوید کے نام'' ہے جو ''بالِ جبریل'' میں شامل ہے۔ اس کے بارے میں جناب جاوید اقبال اپنی مشہور تصنیف ''مئے لالہ فام'' میں لکھتے ہیں:

''**1931**ء میں جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے ابا جان انگلستان گئے تو اس وقت میری عمر کوئی سات سال کے لگ بھگ تھی۔ میں نے انہیں ایک اوٹ پٹانگ سا خط لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ جب وہ واپس تشریف لائیں تو میرے لئے ایک گراموفون لیتے آئیں۔ گراموفون تو وہ لے کر نہ آئے' لیکن میرا خط ان کی مندرجہ ذیل نظم کی شانِ نزول کا باعث ضرور بنا۔''

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو — سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں — سفالِ ہند سے مِینا و جام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں' میری غزل ہے میرا ثمر — مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
مرا طریق امیری نہیں' فقیری ہے — خودی نہ بیچ' غریبی میں نام پیدا کر

پانچ اشعار پر مشتمل یہ نظم بظاہر اقبال نے اپنے بیٹے جاوید ہی کے نام لکھی ہے' لیکن بغور دیکھا جائے تو وہ اس میں ملتِ اسلامیہ کے تمام نوجوانوں سے مخاطب نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

(1) اے بیٹے! تیرے لئے لازم ہے کہ علم و عمل کے ذریعے معاشرے میں اپنی شناخت کرائے اور وہ مرتبہ حاصل کرے جو عزت و احترام کا حامل ہے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ قدیم روایات کو ترک کر کے خود کو نئی اور مثبت جہتوں سے ہم آہنگ کرے۔

(2) خدا کرے' تجھے وہ فطرت شناس دل عطا ہو کہ تُو ان اشیا کے رموز بھی جان سکے جو قوتِ گویائی سے محروم ہیں' اور لالہ و گلاب جیسے پھولوں کی خامشی بھی تیرے لئے کلام بن جائے۔

> خودی ہی ایسا جذبہ ہے جس کو اپنانے سے فرد کو حیاتِ جاودانی نصیب ہو سکتی ہے اور وہ اپنے عمل سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

(3) اے فرزند! یورپ کے علوم و فنون اور وہاں کی تہذیب و ثقافت کو حرفِ آخر تصور نہ کر۔ تجھے عروج حاصل کرنا ہے تو اپنی ہی تہذیب اور اپنے ہی وطن کی مٹی' اور اپنے ہی علوم و فنون سے وابستگی پیدا کر۔ مغربی تہذیب مصنوعی اور ناپائیدار ہے' اور مشرق کے علم و فن اور تہذیب میں وطن کی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔

(4) میری شاعری کو یوں سمجھو' جیسے میں انگور کی بیل ہوں' اور میری غزل اس کا ثمر ہے یعنی انگور۔ اب یہ تیرا کام ہے کہ میرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر اور اس سے استفادہ کر۔ سادہ لفظوں میں یوں کہیے کہ میں نے اپنی شاعری میں جو اسرار و رموز بیان کئے ہیں' ان کی معرفت حاصل کر کے پوری طرح ذہن نشین کر لے اور انہی پر کاربند ہو جا۔

(5) میں امیر آدمی نہیں ہوں۔ میرا طریقہ امیری نہیں' غریبی ہے۔ بیٹے! خودی نہ بیچ' غریبی میں نام پیدا کر۔

''جاوید کے نام''

نوجوانوں کے نام ایسا ہی ایک پیغام ''جاوید کے نام'' ہی سے دوسری نظم میں بھی دیا گیا ہے۔ یہ نظم بھی ''بالِ جبریل'' میں شامل ہے۔ ہر چند یہ نظم علامہ اقبال نے اپنے فرزند جاوید کے لئے تخلیق کی اور اس میں کچھ نصیحتیں بھی ہیں' مشورے بھی ہیں' دعائیں بھی ہیں لیکن دیکھا جائے تو یہ نظم محض جاوید کی ذات تک محدود نہیں ہے' بلکہ اس کے مخاطب پوری

ملتِ اسلامیہ کے نوجوان ہیں۔

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ!
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ!
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ!
ٹھہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ!

(1) اے فرزندِ عزیز! یہ حقیقت پوری طرح ذہن نشین کر لے کہ خودی ہی ایسا جذبہ ہے جس کو اپنانے سے فرد کو حیاتِ جاودانی نصیب ہو سکتی ہے اور وہ اپنے عمل سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ یہ خودی ہی ہے جو افراد کو عمرِ جاوداں اور قوموں کے عروج کے لئے روشنی فراہم کرتی ہے۔

> اے مسلم نوجوان تُو بھی جہاں چاہے جا' جو چاہے پڑھ' لیکن اپنی خودنگری اور خودشناسی کے گھر کو نہ بھول' اور اپنے دینی شعائر اور اپنی روایات کو ہر وقت پیش نظر رکھ۔

(2) انسان خواہ کتنی ہی غربت' مفلسی یا گمنامی کی حالت میں زندگی بسر کرے' لیکن اگر وہ اس حقیقت کو مدنظر رکھے کہ میں ''صاحبِ مقصود'' ہوں یعنی مجھے اللہ نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ میں اپنی خودی کی تربیت کر کے خلافتِ الٰہیہ کا مستحق بن جاؤں گا تو یہ تصور اسے فروغ (ترقی) بھی عطا کر سکتا ہے اور فراغ (سکونِ قلب) بھی۔ اصل مسئلہ با مقصد زندگی کا ہے۔

(3) اب ذرا ایک پرندے کوے کی جانب دیکھو کہ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اِدھر اُدھر منہ مار کر بڑی چالاکی اور عیاری سے دوسروں کا مال تو ہڑپ کر جاتا ہے' لیکن خود اپنی ذاتی جدوجہد کے ذریعے کبھی اپنی روزی حاصل کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بلند پروازی نہیں ہے۔ یہ بھی جان لو کہ اگر کسی بلند پرواز شاہین کا بچہ کوے کی صحبت میں رہے گا تو وہ اپنی فطری صلاحیتوں سے محروم ہو کر کوے کی سی عادتیں ہی اختیار کر لے گا۔ لہٰذا بری صحبت سے گریز کرو کہ یہ انسان کے اپنے کردار کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔

(4) پورے معاشرے پر نظر ڈالو تو اس امر کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انسانوں میں غیرت وحیا کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔ کسی بھی برائی کو قبول کرتے ہوئے ان کو کسی طرح کی پشیمانی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ سو اے بیٹے! اس صورت حال کے پیش نظر میں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتا ہوں کہ تجھ میں غیرت وحیا کا جذبہ برقرار رہے اور تیری جوانی داغ دار ہونے سے ہمیشہ بچی رہے۔

(5) جہاں تک میری زندگی اور کردار کا تعلق ہے' اس امر سے واضح ہو جائے گا کہ میں ایک خوش طبع' خوش مزاج' خوش اخلاق اور خوش وضع ہونے کے باعث ان خانقاہوں کے قریب تک نہ پھٹک سکا جو تنگ ظرف' خشک طبع اور فساد خیز ملاؤں کی کمین گاہوں میں بنی ہوئی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ نوجوانوں کو جہاں رند مشرب لوگوں کی صحبت سے گریز کرنا چاہئے وہاں ایسی خانقاہوں سے بھی بچنا چاہئے کہ ہر دو مقامات کا ماحول غیرت وحیا سے عاری ہو چکا ہے اور نوجوان نسل کے لئے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

''جاوید سے''

اس عنوان کے تحت یکے بعد دیگرے تین نظمیں ''ضربِ کلیم'' میں شامل ہیں۔ ان تین نظموں کا مخاطب بظاہر ''جاوید'' ہے' مگر درحقیقت مراد تمام مسلم نوجوان ہیں' خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں آباد ہوں۔ ان تینوں نظموں کا پورا متن اور مطلب ملاحظہ ہو:

(1)

غارت گر دیں ہے یہ زمانہ　　ہے اس کی نہاد کافرانہ
دربارِ شہنشہی سے خوشتر　　مردانِ خدا کا آستانہ
لیکن یہ دورِ ساحری ہے　　انداز ہیں سب کے جادوانہ
سرچشمۂ زندگی ہوا خشک　　باقی ہے کہاں مئے شبانہ
خالی ان سے ہوا دبستان　　تھی جن کی نگاہ تازیانہ
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو　　ہے اس کا مذاق عارفانہ
جوہر میں ہو لَا اِلٰـــــہ تو کیا خوف　　تعلیم ہو گو فرنگیانہ
شاخِ گل پر چہک' ولیکن　　کر اپنی خودی میں آشیانہ
وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا　　ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانہ
دہقان اگر نہ ہو تن آساں　　ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ
غافل منشیں نہ وقتِ بازی ست
وقتِ ہنر است و کارسازی ست

(1) پہلے شعر میں اقبال نوجوانانِ اسلام سے کہہ رہے ہیں کہ عصرِ حاضر کی چمک دمک اور فریب میں نہ آ جانا۔ بظاہر یہ بڑا ترقی یافتہ اور تہذیب وتمدن کا دور نظر آتا ہے' لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اہلِ مغرب کی سازشی فطرت اور غلط روش کی وجہ سے موجودہ دور دینِ اسلام کو برباد کرنے والا دور ہے اور اس کی سرشت وجبلّت میں کفر اور لادینی کے سوا اور کچھ نہیں ہے' اس لئے عصرِ حاضر کے برے اثرات سے بچنا ضروری ہے۔

(2) بادشاہوں کے درباروں اور ان کی سرکار میں حاضری سے یہ بہتر ہے' کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں (فقیروں اور درویشوں) کی چوکھٹ پر حاضری دی جائے۔

(3) یہ موجودہ دور جادوگری کا دور ہے اور اس کے سارے طور طریقے جادو جیسے ہیں۔ جس طرح جادوگر ہمارے خیالات اور نظروں کو باندھ کر نقل چیزوں کو اصل بنا کر پیش کرتا ہے اور ان چیزوں کو جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا' حقیقت کا رنگ دے کر ہمارے سامنے لاتا ہے' اسی طرح عہدِ حاضر بھی غلط چیزوں کو صحیح بنا کر پیش کر رہا ہے' اور اس کی یہ ساحری اور جادوگرانہ فریب دہی ہمیں نقل کو اصل سمجھنے پر مجبور کر رہی ہے۔

(4) دورِ حاضر میں اہلِ مغرب کی جادوگری کے باعث ایسی ہوا چلی ہے یا ایسے اسباب پیدا ہوئے ہیں جن سے دریائے زندگی کے سوتے خشک ہو گئے ہیں اور رات کی وہ شراب جو ہمارے آباء واجداد اور ہمارے بزرگ ہمیں پلاتے تھے' یعنی شرابِ معرفت' اب باقی نہیں رہی ہے۔

(5) دورِ حاضر کے مدرسے ان استادوں اور بزرگوں سے خالی ہو چکے ہیں جن کی نگاہ اپنے طالب علموں کو راہِ راست پر رکھنے کے لئے تازیانے کا کام دیتی تھی اور وہ اپنی نظر اور صحبت سے ان کی صحیح تربیت کرتے تھے۔

(6) اس شعر میں جاوید کو خاص طور پر خطاب کیا گیا ہے کہ تُو جس گھر کا چراغ ہے' اس خاندان کا ذوق اور مزاج ہمیشہ سے صوفیانہ اور عارفانہ رہا ہے۔ تمہیں بھی چاہئے کہ اس ذوقِ عارفانہ کو اپنے اندر پیدا کرو اور زندہ وقائم رکھو۔

(7) علامہ نے یہاں ایک اصولی اور بنیادی بات کہی ہے کہ اگر کوئی شخص کلمۂ توحید پڑھ کر دل سے مسلمان بن چکا ہے اور اس کی سرشت میں اس کا اثر پختہ ہو چکا ہے تو پھر اہلِ مغرب

کی تعلیم حاصل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں' کیونکہ وہ ایمان جو اس کی اصلیت میں ہوگا' وہ اسے کھرے اور کھوٹے کی شناخت کرا دے گا اور فرنگی تعلیم سے وہی چیز حاصل کرے گا جو بحیثیت مسلمان اس کے فائدے کی ہوگی اور باقی سب کچھ رد کر دے گا۔

(8) اس شعر میں ایک پرندے کی مثال دے کر راز کی بات بتائی ہے کہ جس طرح پرندہ پھولوں کی شاخ پر چہکتا ہے لیکن نظر اپنے گھونسلے پر رکھتا ہے اور اِدھر اُدھر گھوم کر' پھر اپنے آشیانے میں آ جاتا ہے اسی طرح اے مسلم نوجوان تُو بھی جہاں چاہے جا' جو چاہے پڑھ' لیکن اپنی خودنگری اور خودشناسی کے گھر کو نہ بھول' اور اپنے دینی شعائر اور اپنی روایات کو ہر وقت پیش نظر رکھ۔

(9) آدمی کوئی معمولی اور سرسری چیز نہیں ہے' خاص طور پر مردِ مومن جو خدا کا نائب ہے۔ دیکھنے میں تو وہ پانی کے ایک قطرے کی مانند ہے' یعنی محض ایک فرد نظر آتا ہے' لیکن وہ ایسا قطرہ ہے کہ بے کنار سمندر سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ سو اے مسلم نوجوان! تُو اپنی اس اصلیت کو مت بھول۔

(10) اس شعر میں علامہ نے مسلم نوجوان کو محنت کی قدر و قیمت اور فضیلت سے آگاہ کیا ہے اور ایک کسان کی مثال دے کر سمجھایا ہے کہ اگر کسان آرام طلب اور تن آسان نہ ہو اور رات دن خون پسینہ ایک کر کے محنت کرنے کا عادی ہو تو وہ اس ایک دانے سے جو وہ زمین میں بوتا ہے' سو ہزار دانے لیتا ہے۔ اس لئے اے جوان! تُو بھی محنت کر' تاکہ کامیابی اور خوشحالی تیرے ہاتھ آئے۔

(11) اے مسلم نوجوان! اے میرے بیٹے! یہ کھیل کود اور تفریح کا وقت نہیں ہے' بلکہ کچھ سیکھنے کا وقت ہے۔ غافل ہو کر مت بیٹھ۔ کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ اور کوئی نہ کوئی کام کر کے دکھا۔

(2)

سینے میں اگر نہ ہو دلِ گرم — رہ جاتی ہے زندگی میں خامی
نخچیر اگر ہو زیرک و چست — آتی نہیں کام' کہنہ دامی
ہے آبِ حیات اسی جہاں میں — شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی
غیرت ہے طریقتِ حقیقی — غیرت سے ہے فقر کی غلامی
اے جانِ پدر' نہیں ہے ممکن — شاہیں سے تدرو کی غلامی
نایاب نہیں متاعِ گفتار — صد انوری و ہزار جامی
ہے میری بساط کیا جہاں میں — بس ایک فغانِ زیربامی
اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے — میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی
اللہ کی دین ہے' جسے دے — میراث نہیں بلندنامی
اپنے نورِ نظر سے کیا خوب — فرماتے ہیں حضرتِ نظامی

جائے کہ بزرگ بایدت بود
فرزندیِ من ندارد ت سود

(1) اگر آدمی کے سینے میں عشق کی حرارت رکھنے والا دل نہ ہو تو سمجھئے کہ اس کی زندگی خام ہے' یعنی اس میں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی رہ گئی ہے۔ اس لئے زندگی کو پختہ بنانے کے لئے عشق ضروری ہے۔

(2) اگر شکار (چاہے پرندہ ہو یا جانور) دانا اور چالاک ہو تو کہنہ مشق شکاری بھی اسے اپنے جال میں پھانسنے میں ناکام رہے گا۔ مراد یہ ہے کہ اگر میری قوم کے نوجوان دانا' ہوشیار اور بیدار ہوں تو کوئی ان کو اپنا سیاسی غلام نہیں بنا سکتا۔

(3) آبِ حیات کا چشمہ ضرور موجود ہے جس کا پانی پینے سے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے۔ یہ چشمہ ڈھونڈنے کی شرط یہ ہے کہ آدمی کو اس کی پیاس بھی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ کسی بھی منزل کے حصول کے لئے اس تک پہنچنے کی آرزو کا ہونا ضروری ہے۔

(4) درویش دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک غیرت والے اور خوددار' دوسرے بے غیرت اور بے حیا۔ اقبال نے یہاں سچی درویشی اور فقر کا ذکر کیا ہے کہ اس میں غیرت' خودداری اور حیا ہوتی ہے۔ صحیح فقر (درویشی) کی غلامی غیرت (خودداری) سے ہاتھ آتی ہے۔

(5) اے بیٹے! شاہین بن' تیتر نہ بن کیونکہ شاہین کبھی تیتر کا غلام یا شکار نہیں بن سکتا۔ ہمیشہ تیتر ہی شاہین کا شکار بنتا ہے۔ مقصود اس نصیحت سے یہ ہے کہ شاہین جیسی خوددار اور آزادانہ زندگی گزار' تیتر جیسی بے ہمت اور غلام زندگی نہ گزارو۔

(6) متاعِ گفتار یعنی شاعری کوئی ایسی دولت نہیں ہے جو کہیں نہ ملے۔ اس دنیا میں انوری اور جامی جیسے سینکڑوں شاعر موجود ہیں۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کس شاعر کی شاعری افراد یا قوم کو بیدار کرتی ہے اور کس کی شاعری انہیں سلا دیتی ہے۔ اس لئے اگر شاعری کا ذوق ہو تو ایسا شعر کہہ کہ جس سے سوئی ہوئی قوم جاگ اٹھے۔

(7) پچھلے شعر میں علامہ نے شاعر اور شاعری کی بات کی ہے۔ علامہ چونکہ خود بھی شاعر ہیں' اس لئے کہتے ہیں کہ اس دنیا میں بطور شاعر میری حیثیت ہی کیا ہے۔ میری شاعری تو اس آہ و فغاں کی طرح ہے جو کوئی شخص چھت کے نیچے کھڑے ہو کر کرے۔ مراد یہ ہے کہ میں تو غلام قوم میں پیدا ہوا ہوں۔ اگر آزاد قوم میں پیدا ہوا ہوتا تو میری آہ و فغاں اس شخص کی طرح ہوتی جو چھت کے اوپر کھڑے ہو کر اسے بلند کرتا۔ وہ فریاد سنی بھی جاتی۔ میری فریاد کون سنتا ہے۔

DAIRY & LIVESTOCK

عمر ڈیری اینڈ لائیو سٹاک

کی پیشکش

خالص اور تازہ دودھ

فی زمانہ اگرچہ یہ یقین کرنا انتہائی مشکل ہے کہ اس نفسانفسی کے دور میں خالص دودھ بھی مل سکتا ہے

لیکن ہم آپ کو — ریٹ فی لٹر — 18 روپے

ملاوٹ سے پاک...... بغیر برف ملے

خالص' تازہ اور قدرتی دودھ

کی مارکیٹ ریٹ پر آپ کے گھر تک فراہمی کی گارنٹی دیتے ہیں

آپ ایک بار آزما کر دیکھیں

ہمارے دعوے کی سچائی پر آپ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ان شاء اللہ

ماڈل ٹاؤن' گارڈن ٹاؤن' فیصل ٹاؤن' ٹاؤن شپ' جوہر ٹاؤن' اقبال ٹاؤن اور گلبرگ کے رہائشی حضرات فوری رابطہ کریں

نوٹ: عید قرباں کے لئے ہمارے فارم سے انتہائی مناسب ریٹ پر بکروں کی فراہمی کا انتظام ہے

رابطہ کے لئے: 67-D/1' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 5885270

(8) اس شعر میں بھی علامہ نے شاعری ہی کی بات کو آگے بڑھایا ہے' اور کہا ہے کہ میری شاعری سچی شاعری ہے۔ میں اپنے کلام میں وہی کچھ کہتا ہوں جو ایک سچے شاعر کو کہنا چاہئے' اس لئے میں لوگوں کی نظروں میں بلند نام' عزت دار اور قدر و منزلت والا سمجھا جاتا ہوں۔

(9) نام کی شہرت اور بلند نامی کوئی خاندانی وراثت نہیں ہے' بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اللہ جسے چاہے' عطا کر دے۔ اس کے لئے اعلیٰ کردار و عمل ضروری ہے۔ یہ بھی اللہ ہی کی توفیق ہے۔

(10) اور (11): ان دو شعروں میں علامہ نے براہ راست اپنے بیٹے جاوید کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ دیکھو' مشہور فارسی شاعر نظام گنجوی نے اپنے بیٹے سے کیا اچھی بات کہی ہے کہ جس جگہ تجھے بزرگی و احترام کا مرتبہ حاصل ہونا چاہئے' وہاں تجھے میرا بیٹا ہونا کوئی فائدہ نہ دے گا' بلکہ تمہارے ذاتی جوہر اور اوصاف کام آئیں گے' کیونکہ بزرگی و عزت اپنے کردار و عمل سے ملتی ہے' وراثت سے نہیں۔

(3)

مومن پہ گراں ہیں یہ شب و روز — دین و دولت قمار بازی
ناپید ہے بندۂ عمل مست — باقی ہے فقط نفس درازی
ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک و حمام کے لئے موت — ہے اس کا مقام شاہبازی
روشن اس سے خرد کی آنکھیں — بے سرمۂ بوعلی و رازی
حاصل اس کا شکوہِ محمود — فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
تیری دنیا کا یہ سرافیل — رکھتا نہیں ذوقِ نے نوازی
ہے اس کی نگاہِ عالم آشوب — درپردہ تمام کارسازی
یہ فقرِ غیور جس نے پایا — بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی

مومن کی اسی میں ہے امیری
اللہ سے مانگ یہ فقیری

> میں اپنے کلام میں وہی کچھ کہتا ہوں جو ایک سچے شاعر کو کہنا چاہئے' اس لئے میں لوگوں کی نظروں میں بلند نام' عزت دار اور قدر و منزلت والا سمجھا جاتا ہوں۔

(1) مسلمانوں کے لئے اس دور کے شب و روز بڑے کٹھن اور مشکل ہیں' کیونکہ موجودہ زمانہ مغربی تہذیب و تمدن کی وجہ سے اتنا خراب ہو چکا ہے کہ دین اور حکومت دونوں جواری بن گئے ہیں۔ دونوں اپنے اغراض و مفادات کے لئے عوام کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں۔

(2) اس زمانے میں صاحبِ کردار اور عمل مست لوگ ناپید ہو گئے ہیں' البتہ سانسوں کو طول دینے والے یعنی بیکار زندگی گزارنے والے لوگ عام ہیں۔

(3) اگر تجھ میں درویشی کی خواہش ہو اور اس کے حصول کی ہمت ہو تو ایسا فقر (درویشی) تلاش کر جس کی جڑ حجاز میں ہو یعنی وہ فقر جو اسلامی فقر ہے' وہ فقر جس پر رسولِ کریم ﷺ کو بھی فخر تھا' اور جسے آپؐ نے ''الفقر فخری'' کہا تھا۔ اس کے سوا جو درویشی ہے' وہ غیر اسلامی بھی ہے اور محض ڈھونگ بھی۔

(4) اے بیٹے! میں جس اسلامی اور حجازی فقر کی بات کر رہا ہوں' اس فقر سے آدمی کے اندر اللہ کی شانِ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ فقر کسی نفس یا کسی شے کا محتاج نہیں

> **مچھلی کا تیل**
>
> لارڈ کچنر کا جہاز سمندر میں غرق ہو گیا تھا اور یہ یقین پختہ ہو گیا کہ وہ ڈوب کر مر چکا ہے۔ اسی زمانے میں کسی نے بے پر کی اڑاتے ہوئے کہا: "لارڈ کچنر کو بچا لیا گیا ہے"۔ ایک صاحب نے علامہ اقبال سے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا: "سنا ہے لارڈ کچنر زندہ ہو گیا ہے"۔ اس پر آپ نے بے ساختہ جواب دیا: "ہاں' کاڈلیور آئل (مچھلی کے تیل) کی صورت میں واپس آ گیا ہو تو کوئی تعجب نہیں"۔

ہوتا۔ وہ فقر جس میں احتیاج ہو یا خود محتاج ہو' وہ حجازی نہیں ہے۔

(5) اے بیٹے! میں جس فقر کی بات کر رہا ہوں' وہ شاہبازوں جیسے بڑے مرتبے والے فقر کی بات ہے۔ شاہباز فضاؤں میں آزادانہ اڑتا ہے۔ پہاڑوں پر اپنا ڈیرا بناتا ہے۔ اپنا شکار خود کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ فقر جس سے نبی کریم ﷺ نے بھی پناہ مانگی ہے' وہ محتاجی کا فقر ہے' جس میں فقیر چڑیوں (کنجشک) اور کبوتروں (حمام) کی طرح دانہ دنکا کا محتاج ہوتا ہے اور دوسروں کے بھروسے پر زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ اس کی زندگی نہیں' موت ہے۔

(6) اس شعر میں بھی اسلامی فقر کی بات کی گئی ہے کہ ایک عقل وہ ہے جو اپنی آنکھوں میں بوعلی سینا اور فخر الدین رازی کے فلسفے کا سُرمہ ڈالے روشن تو ہوتی ہے' لیکن یہ عقل طالب کو منزلِ مقصود تک نہیں پہنچاتی اور حقیقت کا مشاہدہ نہیں کراتی۔ دوسری عقل وہ ہے جسے فقر کا سُرمہ روشن کرتا ہے۔ یہ منزلِ مقصود پر بھی پہنچاتی ہے اور حقیقت کا مشاہدہ بھی کراتی ہے۔ اس لئے اے بیٹے! فقر والی عقل کی تمنا کر۔

(7) اسلامی فقر محمود غزنوی کا سا دبدبہ اور شکوہ لئے ہوئے ہوتا ہے' شرط یہ ہے کہ اس کی سرشت میں ایازی (غلامی) نہ ہو۔ محمود غزنوی اپنے ایک غلام ایاز کو بہت چاہتا تھا اور اس کی ہر خواہش اور مرضی کو فوقیت دیتا تھا' جس کے نتیجے میں اس کے ذاتی شکوہ اور دبدبے میں فرق آتا تھا۔ فقر بھی اگر کسی کا محتاج ہو اور اپنی شانِ بے نیازی اور شکوہ برقرار نہ رکھ سکے تو وہ بھی درست نہیں۔ اسلامی فقر کا جلال اور دبدبہ اس میں ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو بلکہ دوسرے اس کے محتاج ہوں۔

(8) دورِ جدید' جس نے اپنی مادی ترقی کے باوجود شرفِ انسانیت کو برباد کر کے رکھ دیا ہے' اپنے اندر ایسی صلاحیت و طاقت نہیں رکھتا کہ مُردہ دلوں کو زندہ کر دے۔ جس طرح قیامت کے روز اسرافیل صُور پھونکے گا تو سب مُردے قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے' دورِ جدید کی بانسری میں اس قسم کی تاثیر نہیں ہے۔ ہاں فقر کی بانسری بجانے کا اگر ذوق نصیب ہو تو وہ اسرافیل کی طرح آدمی کے مُردہ دل کو زندہ کر سکتی ہے اور زمانۂ جدید کے آدمی کو حیوان سے انسان اور مُردہ دل سے زندہ دل بنا سکتی ہے۔

(9) مردِ فقیر کی نگاہ اسرافیل کی طرح مُردہ دلوں کو زندہ کرنے والی ہوتی ہے۔ اس کی نگاہ دنیائے دل میں تلاطم پیدا کر کے اس کو صحیح دل بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایسی نگاہ جو دنیا میں انقلاب پیدا کر دے' لوگوں کی تقدیر یں بدل دے وہ پوشیدہ طور پر کارساز (دوسروں کے کام بنانے والی) ہوتی ہے۔ آج کے پیشہ ور فقیر خود گداگر ہیں۔ وہ اپنی محتاجی دور نہیں کر سکتے' دوسروں کے بگڑے ہوئے کام کیسے بنائیں گے۔ یہ کام اصل فقر اور اسلامی فقیر کا ہے کہ وہ لوگوں کی کارسازی کرتا ہے۔

(10) جس شخص کو خودداری اور غیرت والا فقر حاصل ہو جاتا ہے' اسے میدانِ جنگ میں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لئے تلوار اور نیزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ان آلاتِ حرب کے بغیر ہی فریقِ مقابل کے سامنے آ جاتا ہے اور اپنی نگاہ سے تلوار اور نیزے کا کام لیتا ہے۔ مردِ فقیر کی نگاہ تقدیریں بدل دیتی ہے۔ وہ تلوار کا نہیں' نگاہ کی ضرب لگانے والا مردِ میدان ہوتا ہے اور ہمیشہ فتح یاب ہو کر غازی بنتا ہے۔

(11) جو اہلِ ایمان واقعی مردِ مومن ہوتا ہے' اس کی امیری دولت کی امیری نہیں ہوتی بلکہ

دولتِ فقر کی امیری ہوتی ہے۔ دھن دولت تو چھاؤں ہے۔ آج ہے کل نہیں ہے۔ فقر کی دولت وہ دولت ہے جس کو نہ زوال ہے اور نہ کوئی اسے چھین سکتا ہے۔ اے بیٹے! اللہ سے دعا کر کہ وہ تمہیں فقر کی یہ دولت عطا کر دے۔ دنیا کی دولت تو آنی جانی شے ہے اس پر فقر کی دولت کو قربان نہ کر دینا۔

''خطاب بہ جاوید''

(سخنے بہ نژادِ نو)

اقبال کی ایک نظم ایسی ہے جس میں انہوں نے نوجوان نسل (نژادِ نو) کے متعلق اپنے خیالات اور پیغام کو ایک واضح ربط اور تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے اور یوں یہ نظم نوجوانوں کے متعلق اقبال کے جملہ تصورات کا ایسا مرقع بن گئی ہے جس میں فکر اور شعر دونوں کے رنگ پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں جو آپس میں مل جل کر مرقع کو ایسی صورت دیتے ہیں کہ ان سے قلب و نظر دونوں کو زندگی ملتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے ''خطاب بہ جاوید'' جبکہ ذیلی عنوان ہے ''سخنے بہ نژادِ نو''۔ گویا اقبال کو خود بھی خیال تھا کہ کہیں ''خطاب بہ جاوید'' کا مطلب جاوید بیٹے سے خطاب نہ لیا جائے' اس لئے انہوں نے دوسرے عنوان سے وضاحت کر دی کہ یہ گفتگو دراصل نئی نسل سے ہو رہی ہے۔

یہ نظم ''جاوید نامہ'' کے آخر میں درج ہے جس کے مطالب' مولانا اسلم جے راج پوری مرحوم کی تجویز کے مطابق' پورے عالمِ اسلام کے نصاب تعلیم کا جز بننے کے لائق ہیں۔ اس فارسی نظم کے مطالعے سے قاری جن گوناگوں کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے' ان کا ظہور صرف اس وقت ہوتا ہے جب فلسفہ و شعر کی سطح ایک ہو جائے اور دونوں اپنا سفر پوری طرح ہم آہنگ ہو کر طے کریں۔ اس نظم کا پورا فارسی متن ترجمے اور کسی قدر تشریح کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ نوجوانانِ پاکستان یہ نظم حفظ کر لیں گے۔

پہلا بند

این سخن آراستن بے حاصل است　　برنیاید آنچہ در قعرِ دل است
گرچہ من صد نکتہ گفتم بے حجاب　　نکتۂ دارم کہ ناید در کتاب
گر بگویم می شود پیچیدہ تر!　　حرف و صوت او را کند پوشیدہ تر
سوزِ او را از نگاہِ من بگیر
یا زآہِ صبح گاہ من بگیر!

(1) یہ جو میں نے گفتگو کی انجمن سجائی ہے' اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ جو کچھ میرے قلب کی گہرائی میں ہے' اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مراد یہ ہے کہ دل کی بات زبان ادا نہیں کر سکتی۔

(2) اگرچہ میں نے اپنی شاعری میں سینکڑوں رمز کی باتیں کھول کر بیان کی ہیں' لیکن میں ایک ایسا نکتہ (رمز) رکھتا ہوں جو تحریر میں نہیں آ سکتا۔

(3) اگر میں یہ نکتہ بیان کرتا ہوں تو ایسا کرنے سے یہ مزید الجھ جائے گا۔ میرے الفاظ اور میری آواز اس نکتے کو پہلے سے بھی زیادہ پوشیدہ کر دے گی۔

(4) اس نکتے کا سوز میری نگاہ سے یا پھر میری آہِ سحر گاہی سے حاصل کر۔ مراد یہ ہے کہ اس نکتے نے میری نگاہ میں جو سوز اور میری آہِ سحر گاہی میں جو درد پیدا کیا ہے' اگر تو اس کو میرے دل کی باریک بات کا نشان سمجھے تو شاید اس سے اصل بات کی طرف رجوع کر سکے۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکے گا جب تُو خود صاحبِ سوز ہوگا۔

اقبال نے ساری زندگی اپنی شاعری کے ذریعے نوجوانوں کی جو فکری رہنمائی کی ہے' ان اشعار میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس ایک نکتے کی طرف اقبال اپنے نوجوانوں کی توجہ مبذول کرا رہے ہیں' اس کے متعلق اقبال کا خیال ہے کہ وہ اگر ''حرف و صوت'' کی مدد سے بیان کیا جائے تو اس کا مفہوم واضح ہونے کے بجائے الجھ جائے گا۔ اس

علامہ کی قیام گاہ (۱۹۲۲ء تا ۱۹۳۵ء)

لئے اقبال کہتے ہیں کہ اس نکتے کا راز اگر تمہیں کہیں ملے گا تو میری نگاہ میں یا میری آہ سحر گاہی میں۔

دوسرا بند

مادرت درسِ نخستیں باتو داد　　غنچۂ تو از نسیمِ او کشاد
از نسیمِ او ترا ایں رنگ و بُو ست　　اے متاعِ ما بہائے تو ازو ست
دولتِ جاوید ازو اندوختی　　از لبِ او لاالہٰ آموختی
اے پسر! ذوقِ نگہ از من بگیر　　سوختن در لاالہ از من بگیر
لاالہ گوئی؟ بگو از روئے جاں　　تاز اندامِ تو آید بوئے جاں
مہر و مہ گردد زسوزِ لاالہ　　دیدہ ام ایں سوز را در کوہ و کہ!
ایں دو حرف لاالہٰ گفتار نیست　　لاالہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است
لاالہٰ ضرب است و ضربِ کاری است

(1) بیٹے! پہلا سبق تجھے تیری ماں نے دیا اور تیرا غنچہ اُس کی نسیم سے کھلا۔ مراد یہ ہے کہ تیری پہلی تربیت گاہ ماں کی گود تھی' جس نے لوریاں دے دے کر تیرے کانوں میں ''لاالٰہ'' کا رس گھولا۔

(2) یہ تیرے اندر جو رنگ و بُو ہے' یہ سب ماں کی نسیم سے ہے۔ اے میری متاعِ عزیز! تیری قیمت ماں کی تربیت سے ہے کہ اسی کی تربیت نے وہ کچھ بنایا ہے' جو تُو اب ہے۔

(3) تو نے ایمان اور اسلام کی ہمیشہ رہنے والی دولت اسی سے حاصل کی ہے۔ تو نے یہ ''لاالٰہ'' ماں کے ہونٹوں ہی سے سن کر سیکھا ہے۔

(4) اس کا جو کام تھا' وہ اس نے کر دیا۔ اے بیٹے! اب نگاہ کا ذوق مجھ سے حاصل کر۔ لا الٰہ (کلمۂ توحید) تو تُو نے ماں سے سیکھ لیا ہے' اب لا الٰہ کی آگ میں جلنا مجھ سے سیکھ۔ مراد یہ ہے کہ لا الٰہ کو قال (محض گفتگو) سے گزار کر حال (قلبی کیفیت) بنانے کا گُر مجھ سے سیکھ۔

(5) اگر تُو لا الٰہ کہتا ہے تو پوری روحانی قوت سے کہہ' تا کہ تیرے جسم سے روح کی خوشبو آئے۔ زبان سے کلمۂ توحید ضرور پڑھ' مگر دل سے اس کا اقرار بھی کر۔ کلمۂ توحید کی روح کو اپنے اندر بسا کر اس کے مطابق زندگی بسر کر۔ تیرا ہر رنگ اور تیرا ہر بال توحید کی گواہی دے' یہ ہے کلمۂ توحید کے پڑھنے اور اس کے اقرار کا مقصد۔

(6) چانداور سورج لا الٰہ کے سوز سے گردش کرتے ہیں۔ میں نے اس سوز کو پہاڑ اور تنکے میں یعنی کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں دیکھا ہے۔ یہ ہے وہ نکتۂ توحید' جس کے گرد ہر چیز دائرے کی طرح گھومتی ہے۔

(7) یہ دو حرف ''لا الٰہ '' (کوئی نہیں معبود' سوائے اللہ کے) محض گفتگو نہیں ہیں۔ بیٹے یاد رکھ' یہ ''لا الٰـــہ '' بے زنہار تلوار کے سوا کچھ نہیں۔ (بے زنہار تلوار کو شمشیرِ جوہر دار بھی کہتے ہیں۔ یہ ایسی تلوار ہوتی ہے جس سے کسی کو پناہ نہ مل سکے' جس کے وار کو روکا نہ جا سکے۔)

(8) اس ''لا الٰہ '' کے سوز میں جانا قہاری ہے۔ لا الٰہ ایک ضرب ہے اور کاری ضرب ہے یعنی زبان سے ''لا الٰـــــہ '' کہہ کر یہ سمجھ لینا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں' درست نہیں ہے۔ آدمی مسلمان اس وقت ہوتا ہے جب وہ توحید کا دل سے اقرار کرنے کے بعد پہلے خود پر اسے نافذ کرتا ہے اور پھر دوسروں پر اس کا رنگ جماتا ہے۔

اس بند میں یہ بتانے کے بعد کہ ''لا الٰہ '' کی دولت تُو نے اپنی مشفق ماں کی آغوش میں رہ کر حاصل کی' اقبال کہتے ہیں کہ ''لا الٰـــہ '' کی آگ میں جلنے کا سبق تُو مجھ سے سیکھ' لیکن یہ سبق تیری سمجھ میں اس وقت آئے گا جب تُو ذوقِ نگاہ کی دولتِ بیدار مجھ سے حاصل کرے۔ اقبال بڑے لطیف ایمائی انداز میں یہ بتاتے ہیں کہ ''لا الٰہ '' کے سوز سے سورج اور چاند گردش کرتے ہیں اور کوہ و ماہ میں اسی کے سوز کا عکس نظر آتا ہے۔ اے بیٹے! لا الٰـہ کے ان دو لفظوں کو محض گفتار مت سمجھ۔ ان میں شمشیرِ جوہر دار کی قوت ہے۔ ''لا الٰـــہ '' نہ صرف ضرب ہے بلکہ ضربِ کاری ہے۔

تیسرا بند

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق — مومن و غداری و فقر و نفاق
با پشیزے دین و ملت را فروخت — هم متاع خانہ و هم خانہ سوخت
لاالٰہ اندر نمازش بود و نیست — نازہا اندر نیازش بود و نیست
نور در صوم و صلوتِ او نماند — جلوۂ در کائناتِ او نماند!
آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ — فتنۂ او حُبِّ مال و ترسِ مرگ
رفت از و آں مستی و ذوق و سرور — دینِ او اندر کتاب و او بگور
صحبتش با عصرِ حاضر در گرفت — حرفِ دیں را از دو پیغمبرٗ گرفت
آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد — آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد
تاجہاد و حج نماند از واجبات — رفت جاں از پیکرِ صوم و صلوٰت
روح چوں رفت از صلوٰت و از صیام — فرد ناہموار و ملت بے نظام!
سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی — از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی

از خودی مردِ مسلماں در گذشت
اے خضر دستے کہ آب از سرگذشت

(1) مومن ہو کر غلامی کا کپڑا کمر پر باندھنا اور مومن ہو کر غداری' مفلسی اور نفاق کی زندگی بسر کرنا' یہ متضاد باتیں ہیں۔

(2) اب اسی مومن نے ایک کوڑی کے عوض دین اور قوم کو فروخت کر دیا۔ اس نے گھر اور گھر کا اثاثہ جلا دیا۔

(3) کبھی اس کی نمازوں میں لا الٰـہ (توحید کا رنگ) تھا' اب نہیں ہے۔ اس کے نیاز میں کبھی ناز تھا' اب نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور جس نیاز سے وہ سربسجود ہوتا تھا' اس میں ایک مومنانہ شان تھی جواب نہیں ہے۔

(4) اس کے روزوں اور اس کی نمازوں میں نور نہیں رہا۔ اس کی کائنات میں جلوۂ حق نہیں رہا۔ یعنی آج اس کی نمازیں اور روزے بے تجلی ہیں۔

(5) وہ جس کی زندگی کا ساز و سامان اللہ تھا' اس کا فتنہ حُبِّ مال اور اس کا خوف موت ہے۔ اب وہ مال کی محبت میں گرفتار ہے اور اللہ کی راہ میں جان دینے سے ڈرتا ہے۔ کبھی وہ اپنے مال اور اپنی جان کو اللہ کی ملکیت سمجھتا تھا' اس لئے ان کو بے دریغ اس کی راہ میں خرچ کر دیتا تھا۔ لیکن اب اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہوئے ان کو خرچ نہیں کرتا۔

(6) اب اس سے ذوق و سرور کی مستی چلی گئی ہے۔ اس کا دین کتاب میں اور وہ خود قبر میں ہے' یعنی اس نے قرآن پر عمل چھوڑ دیا ہے اور مُردوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے۔

(7) اس نے عصرِ حاضر کی صحبت اختیار کر لی ہے اور اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو چھوڑ کر زمانۂ حال کے دو پیغمبروں کا دین قبول کر لیا ہے۔

(8) ان دو پیغمبروں میں سے ایک ایران کا تھا' اور دوسرا ہندی نسل کا تھا۔ ایرانی حج سے بیگانہ تھا اور ہندی جہاد سے بے گانہ تھا۔ (ایران کے جھوٹے نبی کا نام مرزا حسین علی بہاء اللہ تھا۔ یہ 1817ء میں ایران کے مقام نور میں پیدا ہوا۔ اس نے صرف حج ہی نہیں' بلکہ پوری شریعتِ محمدی ؐ کو منسوخ کر دیا۔ اس کے پیروکار بہائی کہلاتے ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والے جھوٹے نبی کا نام مرزا غلام احمد تھا جو 1838ء میں قادیان میں پیدا ہوا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کرتے وقت جہاد کی نفی کر دی۔)

(9) جب حج اور جہاد مسلمانوں کے لئے واجب نہ رہے تو پھر نماز اور روزے سے بھی جان نکل گئی' یعنی وہ بھی بے اثر ہو گئے۔

(10) جب نماز اور روزے سے روح نکل گئی تو فرد بے لگام اور ملّت بے نظام ہو گئی۔

(11) مسلمانوں کے سینے قرآن کی حرارت سے خالی ہو گئے تو ایسے مردوں سے اچھائی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔

(12) مردِ مسلماں نے خودی کو چھوڑ دیا۔ اے خضر! مدد کر کہ پانی سر سے گزر گیا ہے۔

اس بند میں جو بارہ اشعار پر مشتمل ہے' موجودہ دور کے مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ مسلمان کی نمازیں ''لا الٰـــــہ '' کے سوز سے خالی ہیں اور اس کے نیاز میں ناز مفقود ہے۔ اس کے صوم و صلوٰۃ میں نور کا اور اس کی کائنات میں جلوے کا ظہور نہیں۔ وہ مسلمان کہ جس کے لئے صرف اللہ کا نام سرمایۂ حیات تھا' اب حُبِّ دولت اور خوفِ مرگ کے دام میں اسیر ہے۔ عصرِ حاضر کی صحبت اور دو جھوٹے نبیوں کی جھوٹی تربیت نے اسے دین سے بیگانہ کر دیا۔ اس کے حج اور جہاد کی حیثیت واجبات دین کی نہ رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے صوم و صلوٰۃ کے پیکر بے روح ہو کر رہ گئے' اور جب روزے نماز سے روح رخصت ہوئی تو فرد کی زندگی میں ہمواری اور ملّت کی زندگی میں نظم و ضبط باقی نہ رہا۔

چوتھا بند

سجدۂ کزوے زمیں لرزیدہ است — بر مُرادش مہر و مہ گردیدہ است
سنگ اگر گیرد نشانِ آں سجود — در ہوا آشفتہ گردد ہم چو دُود
ایں زماں جز سر بزیری ہیچ نیست — اندرو جز ضعفِ پیری ہیچ نیست
آں شکوہِ ربی الاعلیٰ کجاست — ایں گناہِ اوست یا تقصیر ماست؟
ہر کسے بر جادۂ خود تند رَو — ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دو

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب
العجب' ثم العجب' ثم العجب!

(1) وہ سجدہ کہ جس سے زمین لرز اٹھتی تھی' جس کی مراد پر سورج اور چاند گردش کرتے تھے۔

(2) اس سجدے کا نشان اگر پتھر خود پر ثبت کر لیتا تھا تو وہ پتھر دھوئیں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتا تھا۔

(3) وہ سجدہ موجودہ زمانے میں سوائے سر جھکانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس میں سوائے بڑھاپے کی کمزوری کے اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی نماز محض مجبوراً اور بڑی مصیبت سمجھ کر ادا کرتے ہیں' اس میں کوئی ذوق و شوق نہیں ہوتا۔

(4) وہ ربی الاعلیٰ کا دبدبہ کہاں ہے؟ یہ اس کا گناہ ہے یا ہماری تقصیر ہے؟ جب مسلمان

سجدے میں ''ربی الاعلیٰ'' کہتا ہے تو وہ یہ الفاظ زبان سے ضرور ادا کرتا ہے' لیکن ''اعلیٰ'' رب کے سوا کسی غیر رب کو سمجھتا ہے۔

(5) ہر کوئی اپنے راستے پر سرپٹ دوڑا جا رہا ہے۔ ہماری اونٹنی بغیر نکیل کے ہے اور بے مقصد دوڑی جا رہی ہے۔ یعنی آج مسلمان اللہ کی راہ چھوڑ کر اپنے بنائے ہوئے راستوں پر' جن کی کوئی منزل نہیں ہے' دوڑے جا رہے ہیں۔

(6) کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان قرآن رکھتا ہے' لیکن طلب کا ذوق نہیں رکھتا۔ عجب ہے!

اس بند میں اقبال عہد حاضر کے مسلمانوں کے سجدے کی بے کیفی کا ذکر کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ ہمارے ''ربی الاعلیٰ'' کا شکوہ آخر کہاں گیا اور صاحب قرآن ہوتے ہوئے مسلمان ذوق و شوق سے خالی کیوں رہ گیا!

پانچواں بند

گر خدا سازد ترا صاحب نظر | روزگارے را کہ می آید نگر
عقل ہا بے باک و دل ہا بے گداز | چشم ہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن' دین و سیاست' عقل و دل | زوج زوج اندر طواف آب و گل
آسیا آں مرز و بوم آفتاب | غیر بین' از خویشتن اندر حجاب
قلب او بے واردات نو بنو | حاصلش را کس نگیرد باد و جو
روزگارش اندریں دیرینہ دیر | ساکن و یخ بستہ و بے ذوق سیر
صید ملایان و نخچیر ملوک | آہوئے اندیشہ او لنگ و لوک
عقل و دین و دانش و ناموس و ننگ | بستۂ فتراک لردان فرنگ
تا ختم بر عالمِ افکار او | بردریدم پردۂ اسرار او
درمیانِ سینہ دل خوں کردہ ام
تا جہانش را دگرگوں کردہ ام

(1) اگر خدا تجھے صاحب نظر بنائے تو جو زمانہ آنے والا ہے' اسے غور سے دیکھنا۔

(2) یہ آنے والا زمانہ ایسا ہوگا کہ جس میں لوگوں کی عقلیں بے باک اور دل بے گداز ہوں گے' آنکھیں بے شرم و حیا ہوں گی اور مجاز (ہوس) میں غرق ہوں گی۔

(3) علم و فن' دین و سیاست' عقل و دل سب کے سب گروہ در گروہ آب و گل کے طواف میں لگے ہوئے ہیں' یعنی ان سب میں مادہ پرستی کا دور دورہ ہے۔ روح سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ سب تن کے دلدادہ ہیں۔

(4) ایشیا جو آفتاب کی جنم بھوی ہے' یہاں کے رہنے والے خود سے تو حجاب میں ہیں اور غیروں کا نظارہ کر رہے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ کبھی علوم و فنون بھی مشرق سے نکلتے تھے۔ آج مشرق جہالت کی تاریکی میں ہے' اپنے علوم و فنون سے ناواقف اور یورپ کے علوم و فنون کا شیدائی۔

(5) ایشیا کا قلب نئی نئی واردات سے خالی ہے۔ اس کے فکر و خیال کو کوئی جو کے دو دانوں کے عوض بھی خریدنے کے لئے تیار نہیں۔

(6) اس پرانی' گھسی پٹی دنیا میں اس کی زندگی ساکن' یخ بستہ' جامد اور سیر و حرکت کے ذوق کے بغیر ہے۔

(7) وہ جاہل اور غلط کار مُلاؤں اور بادشاہوں (نوابوں' جاگیرداروں اور وڈیروں) کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ تو ایسا ہرن ہے جس کا فکر لنگڑا اور گھٹنوں کے بل ہاتھ ٹیک کر چلنے والا ہے۔

(8) اس کی عقل' دین' دانش' ناموس و ننگ' فرنگیوں کے لارڈوں کی فتراک میں (شکار کی طرح) بندھے ہوئے ہیں' یعنی یہ سب کچھ فرنگیوں کے تابع ہیں۔

(9) میں نے مشرق کے افکار پر چڑھائی کی اور اس کے پردوں کو چاک کر دیا' یعنی میں نے اہلِ مشرق کی کمزوری کا راز کھول کر بیان کر دیا ہے۔

(10) اہلِ مشرق کی حالت زار دیکھ کر میں نے اپنے سینے میں دل خون کر لیا ہے' تب جا کر

شیطان اور یورپ

کیمبرج یونیورسٹی میں ایک دفعہ مذہب پر بحث چھڑ گئی۔ ایک آدمی نے باتوں باتوں میں علامہ سے پوچھا: ''یہ کیا بات ہے کہ آج تک جتنے بھی پیغمبر اس دنیا میں آئے ہیں وہ ایشیا ہی میں مبعوث ہوئے' یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا؟'' علامہ اقبال نے فوراً جواب دیا: ''بھئی دراصل بات یہ ہے کہ شروع شروع میں اللہ تعالیٰ اور شیطان نے اپنا اپنا پینترا جمایا۔ اللہ نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو''۔ اس پر وہ صاحب بول اٹھے ''تو پھر شیطان کے فرستادہ پیغمبر کیا ہوئے؟'' آپ نے فرمایا: ''یہ تمہارے میکاولی شیطان ہی کے تو پیغمبر ہیں''۔

میں نے ان کی دنیا بدلی ہے۔

اس بند میں اقبال ایک بار پھر نوجوان سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تجھے صاحب نظر کرے تو اس دنیا کی ایک جھلک دیکھ جو اس وقت تیرے سامنے ہے۔ ان دنیا والوں کی عقلیں بے باک ہیں' ان کے دل گداز سے خالی ہیں' ان کی آنکھوں میں شرم باقی نہیں رہی اور وہ سرتاپا ''مجاز'' میں غرق ہیں۔ اس عہد میں علم و فن' دین و سیاست اور عقل و دل سب آب و گل کے طواف میں مصروف ہیں۔

چھٹا بند

من بہ طبعِ عصرِ خود گفتم دو حرف | کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف
حرف پیچاپیچ و حرفِ نیش دار | تا کنم عقل و دلِ مرداں شکار
حرفِ تہ دارے بانداز فرنگ | نالۂ مستانہ از تارِ چنگ
اصلِ ایں از ذکر و اصلِ آں ز فکر | اے تو بادا وارثِ ایں فکر و ذکر
آبجویم از دو بحر اصلِ من است | فصلِ من فصل ست و ہم وصلِ من است
تا مزاجِ عصرِ من دیگر فتاد
طبعِ من ہنگامۂ دیگر نہاد

(1) میں نے اپنے زمانے کی طبیعت کے بارے میں دو باتیں کی ہیں۔ یوں سمجھو کہ یہ دو باتیں نہیں ہیں' بلکہ دو سمندروں کو دو برتنوں میں بند کر دیا ہے۔

(2) یہ باتیں پیچ دار اور چبھتی ہوئی ہیں' تاکہ میں مَردوں کی عقل اور دل کو شکار کروں۔ اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میں نے اپنے کلام میں دو قسم کی باتیں کی ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا تعلق عقل اور ذہن سے ہے' اور دوسری وہ ہیں جن کا تعلق دل اور عشق سے ہے۔ ایک قسم میری باتوں کی فکر کے تحت آتی ہے اور دوسری قسم ذکر کے تحت۔ (مثلاً میں نے اپنی کتب ''فلسفہ عجم'' اور ''تشکیل جدید الٰہیات'' میں جو باتیں کی ہیں' وہ عقل و ادراک اور فلسفہ و حکمت و دانش کا پہلو رکھتی ہیں' جبکہ جو باتیں میں نے اپنے اردو اور فارسی منظوم کلام میں کی ہیں' ان پر عشق و مستی غالب ہے' وہاں عقل و حکمت بھی دل کے تابع ہے۔) اے بیٹے! تُو دونوں سے استفادہ کر۔ میں مانتا ہوں کہ میری ساری کتابوں کا انداز پیچ دار' تہ دار اور نیش دار ہے' لیکن میری اور میرے مخاطبین کی ضرورت ہی یہ تھی کہ میں یہ انداز بیان اختیار کروں۔ بات عشق کی ہو یا عقل کی' عام شاعروں کی طرح سادہ انداز میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لئے مشکل اندازِ بیان مجبوراً اختیار کرنا پڑتا ہے۔

(3) میں نے فرنگیوں کی طرح فلسفہ و حکمت کی تہ دار باتیں کی ہیں اور اپنے رُباب کے تاروں سے مستانہ نالے بھی پیدا کئے ہیں' یعنی مومنانہ اور عاشقانہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔ تقاضائے وقت کے مطابق میں نے عشق و عقل کے دونوں اسلوب اختیار کئے ہیں۔

(4) عشق کی اصل ذکر ہے' اور عقل کی اصل فکر ہے۔ اے کاش تُو ان دونوں کا وارث و امین بن جائے۔

(5) میں ایک ندی ہوں۔ میری اصل (عشق وعقل کے) دو سمندروں سے ہے۔ میری جدائی میری جدائی بھی ہے اور میرا وصل بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ میں نے عشق اور عقل کو ان کے جداگانہ اور منفرد اوصاف کے ساتھ بھی بیان کر دیا ہے اور ان کے باہمی تعلق کی بناء پر بھی۔

(6) چونکہ میرے زمانے کا مزاج اور طرح کا ہے' اس لئے میری طبع نے بھی ایک اور طرح کا ہنگامہ کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ پہلے ادوار کے شاعروں نے ان ادوار کے تقاضوں کے مطابق شاعری کی ہے اور میں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق۔ اس وقت ضرورت تھی کہ عقل کی بے راہ روی دکھا کر عشق کی راہ مستقیم دکھائی جاتی' اور محض اُس عقل کو اختیار کرنے کے لئے کہا جاتا جو عشق کے تابع ہے۔ جہاں فکر کی بات کی جاتی' وہاں ذکر کی اہمیت بھی بتائی جاتی اس لئے کہ ذکر بغیر فکر اور فکر بغیر ذکر کے بیکار ہے۔

یہ بند ان تصورات کی تمہید ہے جو اگلے بند میں اقبال پیش کرنے والے ہیں۔ یہ ساتواں بند ایک لحاظ سے پوری نظم کا قلب اور روح ہے۔ اس بند میں اقبال نے عہدِ حاضر کے نوجوان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور علم کے صحیح مفہوم کی وضاحت کی ہے۔

ساتواں بند

نوجواناں تشنہ لب' خالی ایاغ — شستہ رُو' تاریک جاں' روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و ناامید — چشمِ شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں منکر زخود مومن بغیر — خشت بند از خاکِ شاں معمارِ دیر
مکتب از مقصودِ خویش آگاہ نیست — تا بجذبِ اندرونش راہ نیست
نورِ فطرت را زجانِ ما پاک شست — یک گلِ رعنا زشاخِ او نرست
خشت را معمارِ ما کج می نہد — خوئے بط با بچۂ شاہیں دہد
علم تا سوزے نگیرد از حیات — دل نگیرد لذتے از واردات
علم جز شرحِ مقاماتِ تو نیست — علم جز تفسیرِ آیاتِ تو نیست
سوختن می باید اندر نارِ حس — تا بدانی نقرۂ خود را زمس
علم حق اول حواس' آخر حضور
آخرِ او می نگنجد در شعور

(1) عصر حاضر کے نوجوان تشنہ لب ہیں اور ان کے پیالے خالی ہیں' یعنی ان کو نہ ذکر کا خیال ہے نہ فکر کی اہمیت کا اندازہ۔ اس لئے ان کے چہرے چمک دار' جانیں تاریک اور دماغ روشن ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ جسم کی آرائش وتزئین کے تو قائل ہیں' روح کی تجلی کے قائل نہیں۔

(2) وہ کم نگاہ' بے یقین اور ناامید بھی ہیں۔ اُن کی آنکھوں نے جہان میں کوئی چیز نہیں دیکھی' یعنی وہ دنیا کی حقیقت سے آشنا نہ ہو سکے۔ اور ہوتے بھی کیسے' ان کے پاس وہ نگاہ ہی نہیں ہے۔ اُن کو حقیقتِ کائنات کا یقین ہی نہیں ہے۔ وہ زندگی کے مقاصد سے بے خبر ہونے کی بنا پر مایوسانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

(3) یہ نوجوان ناکس ہیں' کسی شمار میں نہیں کیونکہ وہ اپنی ہستی کا انکار کرتے ہیں اور دوسروں کی ہستی پر ایمان لاتے ہیں۔ یعنی وہ اپنی روایات اور اقدار کو ہیچ سمجھتے ہیں اور دوسروں کی روایات اور اقدار کو عزیز جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بُت خانے کا معمار ان کی مٹی سے اینٹیں بناتا ہے اور اپنے بُت خانے میں لگاتا ہے۔

(4) آج کا وہ مکتب' جس میں یہ نوجوان تعلیم پاتے ہیں' اپنے مقصود سے آگاہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں آدمی کے اندر جذب ہونے کی راہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج کا مدرسہ اور آج کا استاد ذہن اور بدن کی عمارتیں تو تعمیر کرتا ہے' لیکن روح اور دل کی عمارتیں مسمار کرتا ہے۔ ان مدرسوں کا علم تن کی پرورش کے لئے ہے' من کی پرورش کے لئے نہیں اور مولانا روم کے الفاظ میں جو علم تن کے لئے پڑھا جاتا ہے' وہ آدمی کو سانپ بن کر ڈس لیتا ہے اور جو علم دل کے لئے پڑھا جاتا ہے وہ آدمی کا یار بن جاتا ہے۔

(5) ہمارے ان مدرسوں اور استادوں نے نوجوانوں کی جانوں سے فطرت کے نور کو دھو ڈالا۔ مدرسے کی شاخ سے ایک شاداب پھول بھی نہیں کھلا' یعنی مردِ حق ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔

(6) ہمارا معمار یعنی مدرسے کا استاد پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھتا ہے۔ وہ شاہین بچوں کو بط کی عادت ڈالتا ہے۔

(7) علم جب تک زندگی سے سوز نہیں لیتا' اس وقت تک دل واردات کی لذت سے آشنا نہیں ہوتا' یعنی بے عشق علم دل کی موت ہے۔

(8) علم سوائے تیرے (یعنی آدمی کے) مقامات کی شرح کے سوا کچھ نہیں ہے۔ علم سوائے تیری آیات کی تفسیر کے اور کچھ نہیں۔ یہ علم جو عصر حاضر نے تجھے دیا ہے' یہ آدمی کو اُس کے مقامات سے ناآشنا کرتا ہے۔ اُسے اُس کے مقصدِ تخلیق سے دور لے جاتا ہے' اس لئے یہ علم درحقیقت جہالت ہے۔ علم تو وہ ہوتا ہے جو تجھے تیری معرفت عطا کرے۔ محض رزق اور تن پروری کے لئے علم حاصل کرنا تو خود کو حیوان بنانا ہے۔ کھانا پینا اور ختم ہو جانا' تو حیوانوں کی زندگی ہوتی ہے۔ بیٹے! علم وہ حاصل کر جو تجھے تجھ سے آشنا کرے' تیری مخفی انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرے اور تجھے انسان بنائے' بلکہ اس سے بھی آگے کے مقامات سے آشنا کرے۔

(9) حس کی آگ میں جلنا چاہئے' تاکہ تُو اپنی چاندی کو تانبے سے الگ پہچان سکے۔ آدمی کو پہلے وہ علوم حاصل کرنے چاہئیں جو ظاہری حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتے ہیں' یعنی علم الاسما کے تحت آفاق کے علم سے آشنا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد وہ علوم حاصل کرنے چاہئیں جو باطنی حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ تب جا کر کھرے کھوٹے اور انسان حیوان کی شناخت ہو گی۔

(10) حق کا علم پہلے حواس سے حاصل کیا جاتا ہے اور آخر میں مشاہدات سے۔ یہ علم جو آخر میں آتا ہے' حضوری پیدا کرتا ہے۔ حضوری ایسی چیز ہے جو عقل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ مراد یہ ہے کہ علمِ حق کی ابتدا بے شک شعور سے ہوتی ہے' لیکن اس کی انتہا کا شعور کسی کے علم میں نہیں۔ اسے صرف کوئی مردِ حق ہی جان سکتا ہے۔

اس بند کے پہلے دو شعروں میں اقبال نے عہدِ حاضر کے نوجوان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے کہ تشنہ لب' خالی ایاغ' شستہ رُو' تاریک جان' روشن دماغ' کم نگاہ' بے یقین اور ناامید۔ اِن خامیوں کا ذمہ دار تعلیم کو ٹھہراتے ہوئے اپنی بات تمثیل اور کنایے کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج کل کی تعلیم اپنے مقصود سے آگاہ نہیں اور اس کی لے نے طالب علم کے جذبِ اندروں تک رسائی حاصل نہیں کی۔ اس کی شاخوں میں گلِ رعنا اگانے کی صلاحیت نہیں اور اس نے شاہین بچوں میں بطخوں کی عادت پیدا کر دی ہے۔ علم جب تک زندگی سے سوز حاصل نہ کرے' دل کو واردات (قلبی) میں کوئی لذت حاصل نہیں ہوتی۔ آج کا علم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ تیرے مقام ومرتبے کی تشریح اور تیری آیاتِ ذات کی تفسیر کرے۔ انسان کو پہلے احساس کی آگ میں جلنا ہوتا ہے' پھر وہ اس قابل بنتا ہے کہ اپنی ذات کے کھوٹے کھرے میں امتیاز کر سکے۔

علمِ حق اول حواس آخر حضور
آخرِ او می نگنجد در شعور!

آٹھواں بند

صد کتاب آموزی از اہلِ ہنر — خوشتر آں درسے کہ گیری از نظر
ہر کسے زاں مے کہ ریزد از نظر — مست میگردد باندازِ دگر
از دمِ بادِ سحر میرد چراغ — لالہ زاں بادِ سحر مے در ایاغ
کم خور و کم خواب و کم گفتار باش — گردِ خود گردندہ چوں پُرکار باش

منکرِ حق نزدِ مُلّا کافر است　　منکرِ خود نزد من کافرتر است
آں بانکار وجود آمد ' عجول　　ایں عجول و ہم ظلوم و ہم جہول
شیوۂ اخلاص را محکم بگیر　　پاک شو از خوفِ سلطان و امیر
عدل در قہر و رضا از کف مدہ　　قصد در فقر و غنا از کف مدہ
حکم دشوار است؟ تاویلے مجو　　جز بقلبِ خویش قندیلے مجو
حفظِ جاں ہا ذکر و فکرِ بے حساب　　حفظِ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب
حاکمی در عالمِ بالا و پست　　جز بحفظِ جان و تن ناید بدست
لذتِ سیر است مقصودِ سفر　　گر نگہ برآشیاں داری مپر
ماہ گردد تا شود صاحب مقام　　سیرِ آدم را مقام آمد حرام
زندگی جز لذتِ پرواز نیست　　آشیاں بافطرت او ساز نیست

رزقِ زاغ و کرگس اندر خاکِ گور
رزقِ بازاں در سوادِ ماہ و ہور

(1) اگر تُو اہل ہنر سے سو کتابیں بھی پڑھے تو اس سے وہ ایک درس بہتر ہے جو تُو کسی مردِ کامل سے حاصل کرے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اولیا کی صحبت کا ایک لمحہ صد سالہ بے ریا طاعت سے بہتر ہوتا ہے۔

> اگر تُو روحانی ترقی چاہتا تو تجھے دنیا کے علائق سے الگ ہونا پڑے گا۔ اس سفر میں جو لذت تجھے نصیب ہوگی' وہ دنیا کی لذتوں سے بڑھ کر ہوگی۔ پرواز کی لذت آشیانے کے سکون کی لذت سے کہیں اعلیٰ وارفع ہوتی ہے۔

(2) ہر شخص اُس شراب سے' جو نظر سے ٹپکتی ہے' اپنے اپنے انداز میں مست ہوتا ہے' یعنی ہر شخص اپنی طلب اور ظرف کے مطابق اس سے فیض یاب ہوتا ہے۔

(3) پچھلے شعر کے مفہوم کو آگے بڑھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ صبح کی ہوا کے جھونکے سے چراغ بجھ جاتا ہے۔ اسی جھونکے سے لالے کے پھول کے پیالے میں شراب آ جاتی ہے' یعنی وہ سرخ وشاداب ہو جاتا ہے۔ چراغ کو موت اور لالے کو زندگی نصیب ہوتی ہے حالانکہ جھونکا ایک ہی ہے۔

(4) اے بیٹے! کم کھاؤ' کم بولو اور کم سوؤ اور اپنے گرد پُرکار کی طرح گھومو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی ذات کا طواف کر۔ غیروں کا دست نگر نہ ہو۔ اپنی معرفت حاصل کرنے میں کوشاں رہ۔ کھانے' سونے اور باتیں کرنے ہی کو زندگی نہ بنالے۔ ان تین چیزوں سے بے تعلقی تجھے تیری خودی کی معرفت اور اس کے استحکام میں مددگار ثابت ہوگی۔

(5) اللہ کا منکر مُلّا کے نزدیک کافر ہے' لیکن میرے نزدیک اپنی ذات کا منکر بڑا کافر ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تو پوشیدہ ہے لیکن تُو خود تو ظاہر ہے۔ ظاہر کا انکار کرنا اور غیب کی جستجو کرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔ پہلے خود کو تلاش کر۔ جب تُو اپنی تلاش کر لے گا تو اللہ بھی مل جائے گا۔ مُلّا اللہ کو اپنے سے باہر ڈھونڈتا ہے جبکہ اللہ اس کے اندر ہے۔ اس کی شہ رگ سے قریب ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ جس نے خود کو تلاش کر لیا' گویا اُس نے اپنے رب کو پا لیا۔ علامہ اقبال نے اسی لئے بار بار کہا ہے کہ خدا کی تلاش کرتے رہو۔ اپنے قریب جاؤ۔ یہ بات حضرت علیؓ کے اس مشہور مقولے پر مبنی ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا' اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

(6) منکرِ حق اللہ کے وجود کے انکار کی وجہ سے عجول (جلد باز) ہے کہ اُس نے بلا سوچے سمجھے اور تحقیق وتفتیش کے بغیر محض جلد بازی سے اُس کے وجود سے انکار کر دیا۔ منکر عجول کے علاوہ ظلوم اور جہول بھی ہے۔ ظلوم اس لئے کہ اس نے اپنا انکار کر کے خود پر ظلم کیا اور اپنی مخفی صلاحیتوں سے بے خبر رہ کر خود سے جاہل رہا۔

(7) اخلاص کا شیوہ سختی سے اختیار کر' اور اس طرح سلطان اور امیر کے خوف سے آزاد ہو جا۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کا دامن خلوص سے تھام لے۔ اس طرح تُو غیر اللہ سے بے نیاز ہو جائے گا۔

(8) تُو طیش میں ہو یا خوشنودی کی حالت میں' دونوں حالتوں میں عدل کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ مفلسی ہو یا امیری' میانہ روی کو نہ چھوڑ۔

(9) اگر اللہ کا کوئی حکم دشوار ہے تو اُس کی تاویل نہ ڈھونڈ۔ کسی مُشکل کشا سے اُس کا حل ڈھونڈ۔ اپنے معنی پیدا نہ کر۔ اپنے قلب کے سوا کہیں اور سے چراغ نہ ڈھونڈ۔

(10) روح کی حفاظت اللہ کے بے حد وحساب ذکر کرنے میں ہے اور جسم کی حفاظت جوانی میں ضبطِ نفس سے ہے۔

(11) عالم بالا وپست (دنیا اور آخرت) میں سرفرازی ہاتھ نہیں آتی' سوائے جان وتن کی حفاظت کے۔

(12) سفر کا مقصد سیر کی لذت ہے۔ اگر تُو اپنے آشیاں ہی رکھے ہوئے ہے تو پھر نہ اُڑ۔ مقصد یہ ہے کہ ترقی کے حصول کے لئے بہت سی آسائشوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر تُو روحانی ترقی چاہتا تو تجھے دنیا کے علائق سے الگ ہونا پڑے گا۔ یاد رکھ' اس سفر میں جو لذت تجھے نصیب ہوگی' وہ دنیا کی لذتوں سے بڑھ کر ہوگی۔ پرواز کی لذت آشیانے کے سکون کی لذت سے کہیں اعلیٰ وارفع ہوتی ہے۔ سکون چھوڑ' حرکت اختیار کر۔ تن کا آرام چھوڑ اور روح کی بالیدگی کے اسباب پیدا کر۔

(13) چاند اس لئے گردش کرتا ہے کہ وہ صاحبِ مقام ہو جائے' یعنی چودھویں کی رات تک مکمل ہو جائے۔ اس کے بعد اُس کا سفرِ ارتقا ختم ہو جاتا ہے' لیکن آدمی کے لئے مقام کرنا حرام ہے۔ وہ تو ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ اس کے ارتقا کی کوئی حد نہیں۔

(14) زندگی' پرواز کی لذت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آشیانہ اس کی فطرت کو راس نہیں آتا۔

(15) کوے اور گدھ کا رزق قبر کی مٹی میں ہے۔ وہ مُردہ لاشوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ بازوں (شاہینوں) کا رزق چاند اور سورج کے نواح میں ہے۔ وہ بلند پرواز کرتے ہوئے فضا میں زندوں کا شکار کرتے ہیں۔

یہ بند پچھلے بند کے افکار وخیالات کا تکملہ ہے۔ اس کا ایک ایک شعر مفہوم اور مزاج کے اعتبار سے ایسا ہے کہ ضرب المثل بن کر زبان وقلب کا وظیفہ بنے۔ چوتھا شعر "کم کھاؤ' کم سوؤ' کم بولو" علامہ اقبال کو ایک خاص موقع پر یاد آیا۔ وہ 6 نومبر 1931ء کو لندن میں "اقبال لٹریری ایسوسی ایشن" کی ایک تقریب میں تقریر کر رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ "1905ء میں جب میں انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مغربی ادبیات اپنی ظاہری دل فریبیوں اور دلکشیوں کے باوجود اُس روح سے خالی ہیں جو انسانوں کے لئے امید' ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے اور جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہئے"۔ آگے چل کر اقبال کہتے ہیں: "اگرچہ میرے ساتھ کوئی فوج نہیں ہے' تاہم رفقا کی ایک کثیر جماعت میرے سامنے ہے۔ آپ اپنی تعداد کو بڑھایئے۔ میں آپ کو وہی نصیحت کرتا ہوں جو میں نے اپنے فرزند کو کی ہے' یعنی

کم خور وکم خواب وکم گفتار باش
گردِ خود گردندہ چوں پُرکار باش

"کم کھاؤ' کم سوؤ' کم بولو' دراصل خواجہ نظام الدین اولیا کا قول ہے' اور یہ مصرع ہو بہو اُس قول کا فارسی ترجمہ ہے۔

چھٹے شعر کے دونوں مصرعوں میں قرآنی آیات کے حوالے ہیں۔ پہلا مصرع سورۂ بنی

اسرائیل کی آیت 11 کی طرف اشارہ ہے:

﴿وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا﴾

''انسان شر اس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہئے۔ انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔''

دوسرا مصرع سورۂ احزاب کی آیت 72 کی طرف اشارہ ہے:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾

''ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اُسے اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے' مگر انسان نے اسے اٹھا لیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔''

> مغربی ادبیات اپنی ظاہری دل فریبیوں اور دلکشیوں کے باوجود اُس روح سے خالی ہیں جو انسانوں کے لئے امید' ہمت اور جرأتِ عمل کا پیغام ہوتی ہے اور جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہئے۔

نواں بند

سرِ دیں صدق مقال' اکلِ حلال　　خلوت و جلوت تماشائے جمال
در رہِ دیں سخت چوں الماس زی　　دل بحق بر بند و بے وسواس زی
سرّے از اسرارِ دیں بر گویمت　　داستانے از مظفر گویمت
اندر اخلاصِ عمل فردِ فرید　　پادشاہے با مقامِ بایزید
پیش او اسپے چو فرزنداں عزیز　　سخت کوش چوں صاحبِ خود در ستیز
سبزہ رنگے از نجیبانِ عرب　　با وفا' بے عیب' پاک اندر نسب
مردِ مومن را عزیز اے نکتہ رس　　چیست جز قرآن و شمشیر و فرس؟
من چہ گویم وصفِ آں خیر الجیاد　　کوہ و روئے آبہا رفتے چو باد
روزِ ہیجا از نظر آمادہ تر　　تند بادے طائفِ کوہ و کمر!
در تگِ او فتنہ ہائے رستخیز　　سنگ از ضربِ سمِ او ریز ریز
روزے آں حیواں چو انساں ارجمند　　گشت از دردِ شکم زار و نژند
کرد بیطارے علاجش از شراب　　اسپ شہ را وا رہاند از پیچ و تاب
شاہِ حق بیں دیگر آں یکراں نخواست　　شرعِ تقویٰ از طریقِ ماجد است

اے ترا بخشد خدا قلب و جگر
طاعتِ مردِ مسلمانے نگر!

(1) دین کا راز سچ بولنے اور حلال کھانے میں ہے۔ خلوت ہو یا جلوت' دونوں جگہ جمالِ خداوندی کا تماشا کرنے میں ہے۔ ظاہر ہے' جب خدا کا جلوہ ہر جگہ نظر آئے گا تو کج فکری اور کج عملی اختیار ہی نہیں کی جاسکتی۔ کوئی دیکھ رہا ہو تو چوری کون کرتا ہے۔

(2) دین کی راہ میں الماس کی طرح سختی کے ساتھ جی۔ حق کے ساتھ دل لگا اور شک و وسواس کے بغیر زندہ رہ۔ مراد یہ ہے کہ دین کی راہ پر اس طرح ثابت قدمی سے چل کہ کوئی چیز بھی تیری راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے اور تیرے پاؤں کو لغزش نہ دلا سکے۔

(3) بیٹے! میں تجھے اسرارِ دین میں سے ایک سرّ (بھید) بتاتا ہوں۔ اس کی وضاحت کے لئے میں تمہیں مظفر بادشاہ کی ایک حکایت بیان کرتا ہوں۔ (سلطان مظفر پندرھویں صدی عیسوی میں گجرات' مشرقی ہند کے علاقے کا ایک طاقتور' بہادر اور دین دار بادشاہ تھا۔)

(4) وہ عمل کے اخلاص میں ایک مثل شخص تھا۔ وہ بایزید بسطامی جیسے مردِ فقیر کا سا مرتبہ رکھنے والا شخص تھا۔

(5) اس کے پاس ایک گھوڑا تھا جو اُسے بیٹوں کی طرح عزیز تھا۔ وہ جنگ کے موقع پر اپنے مالک کی طرح سخت کوش تھا۔

(6) وہ گھوڑا نسل کا سبزہ رنگ اور عرب کے اصیل گھوڑوں میں سے تھا۔ وہ باوفا' بے عیب اور نسب میں پاک تھا۔

(7) اے نکتہ رس بیٹے! مردِ مومن کے لئے قرآن' تلوار اور گھوڑے سے بڑھ کر اور کیا چیز عزیز ہوسکتی ہے۔

(8) میں اُس شریف واصیل اور بہترین گھوڑے کے اوصاف کے متعلق کیا کہوں۔ وہ پہاڑوں اور دریاؤں سے ہوا کی طرح گزر جاتا تھا۔

(9) وہ جنگ کے دن نظر سے بھی زیادہ تیز تھا۔ تیز ہوا کی طرح پہاڑوں اور گھاٹیوں کو عبور کر لیتا تھا۔

(10) اس کی دوڑ میں قیامت کے فتنے تھے۔ اُس کے سم کی ضرب سے پتھر ریزہ ریزہ ہو جاتے تھے۔

(11) ایک روز وہ گھوڑا جو انسان کی طرح ارجمند تھا' پیٹ کے درد کی وجہ سے کمزور اور نڈھال ہوگیا۔

(12) جانوروں کے معالج نے اُس کا علاج شراب سے کیا' اور اس طرح اُس نے بادشاہ کے عزیز گھوڑے کو درد کے پیچ و تاب سے نجات دلائی۔

(13) خداشناس بادشاہ نے پھر کبھی اس گھوڑے کو سواری کے لئے طلب نہ کیا۔ بے شک تقویٰ کا راستہ ہمارے راستے سے جدا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ گھوڑے نے شراب پی لی تھی' اس لئے بادشاہ نے اس پر سوار ہونے کو بھی حق پرستی کے خلاف سمجھا۔

(14) اے بیٹے! خدا تجھے قلب و نظر عطا کرے۔ ایک مسلمان کی اطاعت کا یہ رنگ دیکھ کہ اس نے اُس گھوڑے پر بھی سوار ہونا گوارا نہ کیا جس نے شراب پی لی تھی۔

دسواں بند

دیں سراپا سوختن اندر طلب　　انتہایش عشق و آغازش ادب
آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست　　بے ادب بے رنگ و بو' بے آبرو ست
نوجوانے را چو بینم بے ادب　　روزِ من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا　　یادِ عہدِ مصطفیٰ آید مرا
از زمانِ خود پشیماں می شوم　　در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم
سترِ زن زوج یا خاکِ لحد　　سترِ مرداں حفظِ خویش از یارِ بد
حرفِ بد را بر لب آوردن خطا ست　　کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا ست
آدمیت احترامِ آدمی　　باخبر شو از مقامِ آدمی
آدمی از ربط و ضبطِ تن بہ تن　　بر طریقِ دوستی گامے بزن
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق　　می شود بر کافر و مومن شفیق
کفر و دیں را گیر در پہنائے دل　　دل اگر بگریزد از دل' وائے دل

گرچہ دل زندانیِ آب و گِل است
ایں ہمہ آفاق' آفاقِ دل است

(1) بیٹے! بتاؤں دین کیا ہے۔ دین اللہ کی طلب میں خود کو جلاتا ہے۔ اس کی انتہا عشق ہے اور اس کا آغاز ادب ہے۔

(2) دیکھو' پھول کی آبرو اس کے رنگ اور خوشبو سے ہے۔ بے ادب درحقیقت بے رنگ و بُو اور بے آبرو ہوتا ہے۔

(3) میں جب کسی نوجوان کو بے ادب دیکھتا ہوں تو میرا دن میری رات کی طرح تاریک ہو

جاتا ہے۔
(4) میرے سینے کا اضطراب بڑھ جاتا ہے اور نبی کریم ﷺ کا دور یاد آ جاتا ہے۔
(5) میں اپنے زمانے پر پچھتاتا ہوں کہ ایسے زمانے میں پیدا ہوا جو بے ادب لوگوں کا زمانہ ہے۔ میں خود کو پرانی صدیوں میں چھپا لیتا ہوں، یعنی پرانے باادب زمانے کی یاد میں کھو جاتا ہوں۔
(6) عورت کا ستر اس کا خاوند ہے یا اس کی قبر۔ مرد کا ستر خود کو بُرے دوستوں کی صحبت سے بچانا ہے۔
(7) بری بات کو ہونٹوں پر لانا خطا ہے۔ کافر اور مومن سب اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ سب سے محبت کا برتاؤ کرنا چاہئے۔
(8) آدمیت آدمی کے احترام کا نام ہے۔ تجھے آدمی کے مقام سے باخبر ہونا چاہئے۔
(9) آدمی تن بہ تن کے ربط وضبط سے ہے، یعنی ایک آدمی کے دوسرے آدمی کے ساتھ جو تعلقات ہوتے ہیں، آدمیت اُس کا نام ہے۔
(10) بندۂ عشق خدا سے مسلک (زندگی) لیتا ہے، یعنی جس طرح خدا سب پر مہربان ہے، اسی طرح بندۂ عشق بھی کافر اور مومن دونوں پر مہربان ہوتا ہے۔
(11) کفر اور دین کو دل کی وسعت میں رکھ۔ ایک دل اگر دوسرے دل سے بھاگے تو ایسے دل پر افسوس ہے۔ یعنی قلب میں اتنی وسعت پیدا کر کہ وہ سب سے محبت کرے۔
(12) اگرچہ دل وآب و گل (جسم) کے قید خانے میں ہے، مگر یہ ساری کائنات دل ہی کی کائنات ہے یعنی دل بہت وسیع ہے۔ اس کو دوسروں سے نفرت کر کے تنگ نہ بنا۔

اس بند میں آدمی اور آدمی کے ربط وضبط اور دوستی وشفقت کے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ اس قابل ہیں کہ انہیں حرزِ جاں بنا کر قدم قدم پر اُن سے رہنمائی حاصل کی جائے۔
اقبال کہتے ہیں کہ تُو انسان ہے اس لئے ربط وضبط اور باہمی تعلق کا آئین اختیار کر کے دوستی کے راستے پر چل۔ عشق کے بندے اللہ کے راستے پر چلتے اور اپنی شفقت ومحبت میں کافر و مومن کو یکساں حصہ دار بناتے ہیں۔ اس لئے اے فرزند! کفر اور دین، دونوں کو اپنے قلبِ کشادہ میں جگہ دے۔ اے جانِ پدر! دل اگر دل سے بھاگے تو وہ ہرگز دل نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دل آب وگل کا زندانی ہے، لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ یہ سارا دل کا جہان ہے۔

گیارھواں بند

گرچہ باشی از خداوندانِ دہ   فقر را از کف مدہ، از کف مدہ
سوزِ او خوابیدہ در جانِ تو ہست   این کہن مے از نیاگان تو ہست
در جہاں جز دردِ دل ساماں مخواہ   نعمت از حق خواہ و از سلطان مخواہ
اے بسا مردِ حق اندیش و بصیر   می شود از کثرت نعمت ضریر
کثرتِ نعمت گداز از دل برد   ناز می آرد نیاز از دل برد
سالہا اندر جہاں گردیدہ ام   نم بچشمِ منعماں کم دیدہ ام
من فدائے آنکہ درویشانہ زیست
وائے آں کو از خدا بیگانہ زیست

(1) اگرچہ تُو گاؤں کا مالک ہی کیوں نہ ہو، پھر بھی فقر کو ہاتھ سے نہ دے، ہاتھ سے نہ دے۔
(2) فقر کا سوز تیری جان میں سویا ہوا ہے، یعنی تیرے اندر موجود ہے۔ یہ وہ پرانی شراب ہے جو تجھے تیرے بزرگوں نے عطا کی ہے۔ تیرے بڑے بھی سوزِ فقر رکھتے تھے۔ وہ سوزِ فقر تجھ میں بھی ہے۔
(3) جہاں میں دردِ دل کے سوا کسی اور سامان کی خواہش نہ کر۔ تُو جو بھی نعمت چاہتا ہے وہ خدا سے مانگ، سلطان سے نہ مانگ۔ دردِ دل سے مراد ہے، مخلوق کے دکھوں میں شریک ہونے والا دل۔
(4) بسا اوقات حق اندیش اور حق شناس لوگ نعمتوں کی کثرت کی وجہ سے اندھے ہو جاتے ہیں اور حق وناحق میں تمیز نہیں کرتے۔
(5) نعمتوں کی کثرت دل سے گداز لے جاتی ہے۔ وہ ناز لے آتی ہے اور نیاز لے جاتی ہے۔
(6) میں برسوں دنیا میں گھوما پھرا ہوں۔ میں نے دولت مندوں کی آنکھ میں نم نہیں دیکھا۔
(7) میں اُس شخص کے قربان جس نے درویشانہ زندگی بسر کی۔ افسوس ہے اس شخص پر جو زندگی میں خدا سے غافل رہا۔

بارھواں بند

در مسلماناں مجو آں ذوق و شوق   آں یقیں، آں رنگ و بُو آں ذوق وشوق
عالماں از علمِ قراں بے نیاز   صوفیاں درّندہ گرگ و مُو دراز
گرچہ اندر خانقاہاں ہائے و ہُو ست   کو جوانمردے کہ صہبا در کدو ست
ہم مسلمانانِ افرنگی مآب   چشمۂ کوثر بجویند از سراب
بے خبر از سرّ دین اند ایں ہمہ   اہلِ کین اند اہلِ کین اند ایں ہمہ
خیر و خوبی بر خواص آمد حرام   دیدہ ام صدق و صفا را در عوام
اہلِ دیں را بازداں از اہل کیں   ہم نشینِ حق بجو با او نشیں
کرگساں را رسم و آئیں دیگر است
سطوتِ پروازِ شاہیں دیگر است

(1) آج کے دور میں مسلمانوں میں وہ ذوق وشوق، یقین اور رنگ وبو تلاش نہ کر، جو کبھی ان کے آباء واجداد میں تھا۔
(2) آج کے علمائے دین قرآن کے علم سے بے نیاز ہیں جبکہ صوفی بھیڑیئے اور لمبے لمبے بالوں والے ہیں۔ نہ علماء میں علم دین کی روح ہے اور نہ صوفیوں میں تصوف باقی ہے۔
(3) آج اگرچہ درویشوں کی خانقاہوں میں ہائے وہُو کا شور ہے، لیکن ایسا جواں مرد صوفی کہاں ہے کہ جس کے مٹکے میں تصوف کی شراب ہو۔ سب خالی خولی نعرے لگاتے ہیں۔
(4) مسلمان افرنگیوں سے متاثر ہیں۔ سراب میں سے چشمۂ کوثر ڈھونڈتے ہیں، یعنی تقلید تو کافروں کی کر رہے ہیں اور توقع اسلامی فوائد کی کرتے ہیں۔
(5) یہ سب دین کے بھید سے بے خبر اور باہمی عداوت رکھنے والے یعنی اہلِ کینہ ہیں۔
(6) مسلمانوں کے زعماء میں کوئی خیر وخوبی نظر نہیں آتی۔ البتہ میں نے ان کے عوام میں ابھی تک صدق وصفا کو ضرور دیکھا ہے۔
(7) اہلِ دین کو کینہ وروں سے الگ رکھ۔ دونوں میں فرق کر۔ حق کے ہم نشین کی تلاش کر اور اس کے ساتھ بیٹھ۔ اس کی صحبت اختیار کر۔
(8) گِدھوں کی رسم ودستور اور ہے جبکہ شاہینوں کی پرواز کی ہیبت اور ہے۔ دنیا کے طالب گدھ ہیں اور خدا کے طالب شاہین ہیں۔ گِدھوں کو چھوڑ کر شاہینوں کی صحبت اختیار کر۔

تیرھواں بند

مردِ حق از آسماں اُفتد چو برق   ہیزمِ او شہر و دشتِ غرب و شرق
ما ہنوز اندر ظلامِ کائنات   او شریک اہتمامِ کائنات
او کلیم و او مسیح و او خلیل   او محمدؐ او کتاب، او جبریل
آفتابِ کائناتِ اہلِ دل   از شعاعِ او حیاتِ اہلِ دل

فرنگیانہ نام

انگلستان سے واپسی پر پروفیسر سید وحید الدین نے کہا: "انگلستان پہنچ کر لوگ اپنا نام فرنگیانہ بنا لیتے ہیں۔ آپ کو بھی چاہئے تھا کہ آپ اپنا نام A.K.Ball رکھ لیتے"۔ اس پر علامہ اقبال نے بلا تامل جواب دیا: "بھئی ہم نے نہیں کیا۔ لیکن تم ولایت جاؤ گے تو اس نسخے پر عمل کرنا اور اپنا نام W.A.Heed رکھ لینا۔

اول اندر نارِ خود سوزد ترا / باز سلطانی بیاموزد ترا
ما ہمہ باسوزِ او صاحب دلیم / ورنہ نقشِ باطلِ آب و گلیم
ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں / در بدن غرق است و کم داندز جاں
چوں بدن از قحطِ جاں ارزاں شود / مردِ حق در خویشتن پنہاں شود
در نیابد جستجو آں مرد را / گرچہ بیند روبرو آں مرد را
تو مگر ذوقِ طلب از کف مدہ / گرچہ درکارِ تو افتد صد گرہ
گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر / از ابّ و جد آنچہ من دارم بگیر
پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز / تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست / پائے او محکم فتد در کوئے دوست
شرح او کردند و او را کس ندید / معنی او چوں غزال از ما رمید
رقصِ تن از حرفِ او آموختند / چشم را از رقصِ جاں بر دوختند
رقصِ تن در گردش آرد خاک را / رقصِ جاں برہم زند افلاک را
علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست / ہم زمیں ہم آسماں آید بدست
فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم / ملت از وے وارثِ ملکِ عظیم
رقصِ جاں آموختن کارے بود / غیرِ حق را سوختن کارے بود
تا ز نارِ حرص و غم سوزد جگر / جاں برقص اندر نیاید اے پسر
ضعفِ ایماں است و دلگیری است غم / نوجوانا! نیمہٴ پیری است غم
می شناسی؟ حرص فقرِ حاضر' است / من غلام آنکہ بر خود قاہر است
اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب / تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب

سرِّ دینِ مصطفیٰؐ گویم ترا
ہم بقبر اندر دعا گویم ترا

(1) اگر کوئی مردِ حق ہو تو اس کی شان یہ ہے کہ وہ آسمان سے بجلی کی طرح گرتا ہے۔ اس کا ایندھن شہر' بیابان اور مشرق و مغرب کی ہر چیز ہوتی ہے۔ مردِ حق جب اللہ کی طرف سے دنیا پر مبعوث ہوتا ہے تو وہ باطل کے ایندھن کو اسی طرح جلا دیتا ہے جس طرح بجلی خرمن کو جلا دیتی ہے۔

(2) ہم ابھی تک کائنات کے اندھیروں میں ہیں' اور وہ یعنی مردِ حق کائنات کے انتظام میں شامل و مشغول ہے۔

(3) وہ مردِ حق ہی خلیلؑ ہے' مسیحؑ ہے' کلیمؑ ہے۔ وہ محمد ﷺ ہیں۔ وہ کتاب ہے۔ وہ جبریل ہے۔

(4) وہ اہلِ دل کی کائنات کا آفتاب ہے۔ اس کی شعاعوں سے اہلِ دل کی حیات ہے۔

(5) وہ یعنی مردِ حق پہلے تجھے اپنی آگ میں جلاتا ہے۔ پھر تجھے سلطانی سکھاتا ہے۔

(6) ہم سب اسی کے سوز سے صاحبِ دل ہیں' ورنہ ہم آب و گل (مادہ) کے باطل نقش ہیں۔ مردِ حق کی صحبت سے آدمی دل والا یعنی صحیح آدمی بنتا ہے' ورنہ وہ محض مٹی کا ایک مجسمہ ہے جو چل پھر رہا ہے۔

(7) میں اُس زمانے سے ڈرتا ہوں جس میں تُو پیدا ہوا ہے کیونکہ یہ زمانہ بدن میں غرق ہے اور نہیں جانتا کہ جان کیا ہے۔ یہ تن پرستی کا زمانہ ہے۔ لوگ روح کو بھولے ہوئے ہیں۔ شکم پیشِ نظر ہے' دل پر دھیان نہیں۔

(8) جب روح کے قحط سے بدن سستا ہو جاتا ہے تو مردِ حق خود میں چھپ جاتا ہے' یعنی وہ موجود تو ہوتا ہے لیکن لوگوں کی مادہ پرستانہ نگاہیں اُسے دیکھ نہیں سکتیں۔ اُسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔

(9) ایسے زمانے میں تلاش و جستجو بھی اس مردِ حق کو نہیں پا سکتی' اگرچہ نگاہیں اسے روبرو کیوں نہ دیکھ رہی ہوں۔ یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی پہچان نہیں ہوتی۔

(10) لیکن اے فرزند! تُو ذوقِ طلب کو ہاتھ سے نہ دے' خواہ تیری راہ میں سو مشکلات آئیں۔

(11) اگر تُو کسی مردِ خبیر (خبر رکھنے والے) کی صحبت نہیں پاتا' تو جو کچھ میں نے اپنے آباء و اجداد سے لیا ہے تُو وہ لے لے' وہ بھی تیرے لئے مردِ خبیر کی صحبت کا کام دے گا۔

(12) پیرِ رومی کو راستے کا رفیق بنالے تاکہ خدا تجھے عشق کا سوز و گداز عطا کرے۔

(13) کیونکہ رومی وہ مردِ حق ہے جو مغز کو چھلکے سے الگ کرتا ہے۔ اس کا پاؤں دوست کی گلی میں مضبوطی سے پڑتا ہے۔ وہ محرمِ اسرارِ دوست ہے۔ وہ حق و باطل کی تمیز جانتا ہے۔

(14) لوگوں نے مولانا رومی کی مثنوی کی شرح لکھی' لیکن رومی کو نہ دیکھا' یعنی اس کا راز نہ پایا۔ اُس کا فقر کیا تھا اور اس سے فیض کس طرح حاصل کرنا چاہئے' اس کے معنی ہم سے یوں بھاگے ہیں جیسے کہ ہرن بھاگتا ہے۔

(15) ہم نے اس کے کلام سے تن کا رقص سیکھ لیا اور آنکھوں کو جان کے رقص سے سی لیا' یعنی بند رکھا۔

(16) تن کا رقص مٹی (جسم) کو گردش میں لاتا ہے۔ جان کا رقص افلاک کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔

(17) روح کے رقص سے علم اور حکمت ہاتھ آتی ہے۔ زمین اور آسمان بھی ہاتھ آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ روح کے رقص سے صاحبِ رقص زمان و مکاں پر حاوی ہو جاتا ہے۔

(18) روح کے رقص سے صاحبِ رقص حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا جذب حاصل کر لیتا ہے۔ ملت اس سے ایک عظیم ملک کی وارث بن جاتی ہے' کیونکہ اس رقص سے اس میں نبوت کے فیوض آ جاتے ہیں۔

(19) روح کا رقص سیکھنا آسان نہیں ہے۔ غیرِ حق کو جلانا آسان نہیں ہے۔

(20) جب تک آدمی کا جگر حرص اور غم کی آگ میں جلتا رہے گا' اے فرزند! روح رقص میں نہیں آئے گی۔

(21) غم دل گیری ہے' ایمان کی کمزوری ہے۔ اے جوان! غم آدھا بڑھاپا ہے۔

(22) کیا تُو جانتا ہے کہ حرص عہدِ حاضر کا فقر ہے؟ میں تو اس کا غلام ہوں جو خود پر قاہر ہے' یعنی جو اپنے حرص پر قابو پالیتا ہے۔

(23 اور 24) اے میری بے قرار جان کی تسکین' اے میرے بیٹے! تُو اگر روح کے رقص سے نصیب حاصل کر لے تو پھر میں تجھے دینِ مصطفیٰ ﷺ کا راز بتاؤں گا۔ میں قبر کے اندر بھی تیرے لئے دعا گو رہوں گا۔

اس بند کے آخری چند اشعار پیرِ رومی کو رفیقِ راہ بنانے کی تلقین کرتے ہیں کہ سوز و گداز کی دولتِ بیدار صرف اسی طرح حاصل ہونی ممکن ہے۔ اقبال کو خداوندانِ مکتب اور اہلِ خانقاہ سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے حرفِ رومی کی تشریح تو کی' لیکن اس کی روح تک نہیں پہنچے اور اس لئے حقیقی معنی ہم سے یوں دور بھاگ گئے جیسے تیز رو غزال۔ صوفیوں اور ملاؤں نے پیرِ رومی کے کلام سے رقصِ تن کا سبق تو اخذ کیا' لیکن رقصِ جاں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں' حالانکہ رقصِ تن اور رقصِ جاں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک زمین کی گردش کا سبب بنتا ہے اور دوسرا افلاک کو برہم کرتا ہے۔ رقصِ جاں کی بدولت علم و حکمت اور زمین و آسمان پر تصرف حاصل ہوتا ہے' لیکن اس کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ آدمی جب تک اپنے جگر کو حرص و غم کی آگ سے خاکستر نہ کر دے' جان رقص میں نہیں آتی۔

رقصِ جاں طبیعت کا وہ اضطراب ہے' جس کی طرف اقبال اپنے کلام نثر و نظم میں بار بار اشارے کرتے رہے ہیں۔ موجودہ نسل کے نوجوانوں کو مستقبل کی زندگی کا امین اور پاسبان سمجھ کر وہ ساری زندگی یہ آرزو کرتے رہے ہیں کہ نوجوان کو اُس مثالی انسان کا نمونہ بنائیں جو زمانے کی لگام اپنے ہاتھوں میں لے کر اُس کا رخ اس بہتر زندگی کی طرف پھیر سکے جو خالقِ ازلی کا مقصود ہے۔ اقبال کے پاس بقول ان کے "صرف ایک بے چین اور مضطرب جان ہے"۔ ان کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ اپنا اضطراب کسی ایسے نوجوان

کے دل میں منتقل کر دیں جو اس کا اہل ہو۔ اکبر الٰہ آبادی کے نام ایک خط میں اقبال نے اپنی یہ آرزو ان الفاظ میں ظاہر کی ہے:

''صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان' جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو' مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں''۔ (خط محررہ 25 اکتوبر 1915ء)

اسی اضطراب کا نام ''جاوید نامہ'' کی مذکورہ بالا نظم میں ''رقصِ جاں'' ہے اور اسی کو ''ارمغانِ حجاز'' میں ''تب و تاب'' کہا گیا ہے۔ یہی رقصِ جاں' یہی تب و تاب اور اضطرابِ جاں ہے کہ اگر کسی نوجوان کے دل میں منتقل ہو جائے تو اقبال کے دل سے قبر میں بھی اس کے لئے دعائیں نکلیں گی۔ خود اقبال نے اپنی زندگی میں اس آرزو کو مناجات اور دعا کی صورت دی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ جہاں یہ دعا زبان پر آئی ہے' اس میں آرزو کی دردمندی نے بڑا سوز و گداز اور بڑی تاثیر پیدا کی ہے۔ یہ آرزو اُن کی نظم ''ساقی نامہ'' میں بڑی دل سوزی کے ساتھ دعا کا پیکر اختیار کرتی ہے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق' میری نظر بخش دے
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری' آرزوئیں مری — امیدیں مری' جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار — غزالانِ افکار کے مرغزار
مرا دل مری رزم گاہِ حیات — گمانوں کے لشکر' یقین کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لُٹا دے اِسے — لُٹا دے' ٹھکانے لگا دے اسے

علامہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں جو طویل نظم خطاب بہ جاوید (سخنے بہ نژادِ نو) کے عنوان سے تخلیق کی ہے' اس کے فارسی متن کے ساتھ ہم نثر میں اردو ترجمہ اوپر پیش کر چکے ہیں۔ اس کا اردو میں منظوم ترجمہ جناب نظیر لدھیانوی نے کیا تھا۔ طلبہ کے مزید استفادے کے لئے یہ منظوم ترجمہ بھی یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

شاعری بے فائدہ ہے بالیقیں — دل میں جو ہے وہ اگر لب پر نہیں
گرچہ سو نکتے کئے میں نے بیاں — ایک نکتہ ہے کہ ہے اب تک نہاں
گر کہوں تو اور بھی پیچیدہ ہو — صورت اور الفاظ سے پوشیدہ ہو

یا تو تُو میری نظر میں دیکھ اُسے
یا مری آہِ سحر میں دیکھ اُسے

ماں نے ہے پہلا سبق تجھ کو دیا — تیرا غنچہ اس کے دامن میں کھلا
لطف سے اس کے ہے تیرا رنگ و بُو — ہے اسی سے بے بہا اے لعل تُو
تجھ کو مالِ جاوداں اس سے ملا — تو نے حرفِ لا الٰہ اس سے سنا
اے پسر ذوقِ نگہ اب مجھ سے لے — ساز و سوزِ لا الٰہ اب مجھ سے لے
لا الٰہ کہ روئے جاں سے اے جواں — تا کہ آئے تن سے تیرے بوئے جاں
مہر و مہ ہیں لا الٰہ سے دل فروز — میں نے دیکھا کوہ و کہ میں بھی یہ سوز
لا الٰہ کس نے کہا گفتار ہے — یہ تو اک شمشیرِ جوہردار ہے

جو جئے اس آگ میں قہار ہے
لا الٰہ کی ضرب بے زنہار ہے

مومن اور پیشِ بشر باندھے نطاق — مومن اور ہو بندۂ غدر و نفاق!
دین و ملت بیچے کوڑی کے عوض — اس کو عز و آبرو سے کیا غرض!
لا الٰہ سے بے تہی اس کی نماز — ناز سے محروم ہے اس کا نیاز!
نور سے بے بہرہ ہیں صوم و صلوٰۃ — جلوؤں سے خالی ہے اس کی کائنات

ہائے تھا اللہ جس کا ساز و برگ — ہے اسے اب حُبِّ مال اور خوفِ مرگ
اب کہاں وہ مستی و ذوق اور وہ صبر — دیں کتابوں میں ہے اور وہ زیرِ قبر
رنگ لائی صحبتِ عصرِ جدید — دیں میں ''دو پیغمبروں'' کا ہے مرید
ایک ایرانی ہے اک ہندی نژاد — اس کو حج سے کد' یہ بیزارِ جہاد
جب جہاد و حج سے ہو منکر حیات — کیوں نہ ہو بے جاں تنِ صوم و صلوٰۃ
جب کہ بے جاں ہوں نمازیں اور صیام — فرد کج رو ہو گا ملت بے نظام
قلب ہوں جب سوزِ قرآں سے تہی — کیا بھلا ایسوں سے امید بہی

خود سے مسلم ہو گیا دور اے خضر
الحذر پانی گیا سر سے گزر

سجدہ وہ ہے ہو زمیں جس سے تپاں — مہر و مہ ہوں جس کی مرضی پر رواں
سنگ اگر لے ایسے سجدے کا نشاں — باد پر اڑنے لگے بن کر دھواں
عصرِ نو کیا ہے اسیری کے سوا — کیا ہے اس میں ضعفِ پیری کے سوا
گر شکوہِ رَبِّیَ الْاَعْلٰی گیا — یہ گنہ اس کا ہے یا ہے قوم کا؟
ہر کوئی ہے اپنی رہ پر تندرو — اپنا ناقہ بے لگام اور ہرزہ رو

صاحبِ قرآں ہو بے ذوقِ طلب
العجب' ثم العجب' ثم العجب!

گر خدا تجھ کو کرے صاحب نظر — آنے والے دور کو دیکھ اے پسر!
عقل ہے اس میں نڈر' دل بے گداز — آنکھ ہے بے شرم اور غرقِ مجاز
علم و فن' دین و سیاست' عقل و دل — ہو رہے ہیں سب فدائے آب و گل
وہ وطن خورشید کا وہ ایشیا — غیر بیں ہے خود سے ہے ناآشنا
قلب ہے بے وارداتِ نو بنو — اس کے حاصل کی ہے قیمت ایک جَو
اس پرانے گھر میں اس کا روزگار — سرد ہے اور پُرسکوں مثلِ مزار
صیدِ ملّا اور نخچیرِ ملوک — ہے غزالِ فکر اس کا لنگ و لوک
عقل و دین و دانش و ناموس و ننگ — ہو رہے ہیں صیدِ عیارِ فرنگ
فکر پر کی اس کے یورش بار بار — کر دیا ہر راز اس کا آشکار!

دل کو اپنے سینے میں خوں کر دیا
اس کے عالم کو دگرگوں کر دیا

ہے بیانِ عصرِ نو دو حرف میں — گم کیا بحرین کو دو ظرف میں
حرف پیچیدہ ہے اور ہے نیش دار — تا کروں عقل و دلِ مرداں شکار
حرفِ پیچاں میں ہے اندازِ فرنگ — نالۂ مستانہ ہے اور تارِ چنگ
اصل اس کی ذکر' اُس کی اصل فکر — اے کہ تو ہو مایہ دارِ فکر و ذکر
آبِ جو ہوں دو سمندر میری اصل — فصل میری فصل ہے اور طرحِ وصل

اک نیا انداز رکھتا تھا یہ دور
ڈالا میری طبع نے ہنگامہ اور

نوجواں پیاسے ہیں اور خالی ایاغ — شستہ رُو' تاریک جاں' روشن دماغ!
کم نگاہ و بے یقین اور ناامید — ان کی آنکھیں دہر میں محرومِ دید!
نوجواں ہیں منکرِ خود محوِ غیر — ان کی مٹی سے بنی بنیادِ دیر!
اپنے مقصد سے ہے مکتب بے خبر — جذبِ دل کی راہ سے ہے دور تر!
جاں سے اس نے نورِ فطرت دھو دیا — اک گلِ رعنا نہ گلشن میں کھلا
خشت کج رکھتا ہے یہ معمارِ حال — شیر کو دیتا ہے یہ خوئے غزال
علم جب رکھتا نہیں سوزِ حیات — دل کو کیا حاصل ہو لطفِ واردات

علم ہے شرح مقاماتِ خودی   علم ہے تفسیرِ آیاتِ خودی
چاہئے دل میں ہو پیدا نارِ حس   تا تو جانے یہ کہ تُو زر ہے کہ مس
علمِ حق اول حواس آخر حضور
اس کے آخر پر نہیں حاوی شعور
سو کتابوں کا سبق تُو نے پڑھا   وہ سبق اچھا نظر سے جو ملا
لوگ اس ملنے سے جو رکھتی ہے نظر   مست ہوتے ہیں بانداز دگر
جس ہوائے صبح سے گل ہو چراغ   لالہ اس بادِ بحر سے پُرایاغ
تھوڑا کھا، کم بول، کم سو بالعموم   گرد اپنے صورتِ پرکار گھوم
حق سے ہے انکار کرنا کافری   ہے مگر انکارِ خود کافر تری
ذات کے انکار سے وہ ہے عجول   یہ عجول و ظالم و کور و جہول
شیوۂ اخلاص کو کر اختیار   دل سے گم کر خوف شاہ و شہریار
عدل سے قہر و رضا میں کام لے   قصد سے فقر و غنا میں کام لے
حکم مشکل ہو تو تاویلیں نہ ڈھونڈ   اپنا ہی دل دیکھ قندیلیں نہ ڈھونڈ
حفظ جاں ہے ذکر و فکرِ بے حساب   حفظِ تن ہے ضبطِ دل وقتِ شباب
تو جہاں کا حکمراں ہے میرے شیر!   حفظِ جان وتن سے یہ ہوتا ہے زیر
سیر کی لذت ہے مقصودِ سفر   تُو نہ اڑ گر آشیاں پر ہے نظر
ماہ گردش میں ہے تا پائے مقام   جادۂ انساں میں ہے منزل حرام
زندگی کو مائلِ پرواز رکھ   اس کی فطرت سے ہمیشہ ساز رکھ
رزق ہے زاغ و زغن کا گور میں
رزق شاہیں کا ہے ماہ و ہور میں
سرِ دیں ہے صدقِ قول، اکلِ حلال   خلوت و جلوت میں دیدارِ جمال
راہِ دیں میں سخت ہو الماس بن   دل لگا تُو حق سے بے وسواس بن
سرِ دیں ہو جائے گا تجھ پر عیاں   سن مظفر کی حکایت اے جواں
تھا عمل کے حسن میں فردِ فرید   حکمراں تھا بامقامِ بایزید
اسپ اپنا تھا بہت اس کو عزیز   اپنے راکب کی طرح بے مثل چیز
اس کے آبا میں نجیبانِ عرب   باوفا، بے عیب، پاکیزہ نسب
مردِ مومن کو عزیز اے نکتہ رس   کیا ہے بس قرآن و شمشیر و فرس
کیا کہوں وصف اس کا وہ خیر الجیاد   کوہ اور دریا پہ چلتا مثلِ باد
روز ہیجا تھا نظر سے تیزتر   اک بگولا طائف کوہ و کمر
اس کی رو میں فتنۂ یوم النشور   پتھر اس کی ضربِ سم سے چُور چُور
ہو گیا اک دن وہ اسپ باد پا   ناگہاں دردِ شکم میں مبتلا
دی دوا میں مَے اسے بیطار نے   زندگی پائی نئی رہوار نے
پر سوار اس پر نہ پھر سلطان ہوا
اے جواں یہ ہے کمالِ اتقا
دیں ہے کیا؟ جلنا طلب میں روز وشب   انتہا اس کی ہے عشق، آغاز ادب
آبرو گل کی ہے اس کا رنگ و بو   بے ادب بے رنگ و بُو، بے آبرو
دیکھتا ہوں جب جوانِ بے ادب   دن مرا ہوتا ہے تیرہ مثلِ شب
دل میں ہوتا ہے فزوں جوشِ وداد   مجھ کو عہدِ مصطفیٰؐ آتا ہے یاد
عہد سے اپنے بہت نالاں ہوں میں   کاشِ عہدِ رفتہ میں پنہاں ہوں میں
سترِ زن ہے زوج یا خاکِ لحد   سترِ مرداں کیا ہے، ترکِ یارِ بد
حرفِ بد کو لب پہ لاتا ہے خطا   کافر و مومن ہیں سب خلقِ خدا
ہے شرافت احترامِ آدمی   تُو سمجھ کیا ہے مقامِ آدمی

آدمی کو ہے ضروری میل جول   مہرباں ہو، دوستی کی راہ کھول
مردِ حق ہے اور یزداں کا طریق   کافر و مومن پہ ہے یکساں شفیق!
کفر و دیں کو لے سرِ پہنائے دل   دل ہو گر دل سے گریزاں وائے دل
دل اگرچہ ہے اسیرِ آب و گل
یہ تمام آفاق ہے آفاقِ دل
ہو اگر قسمت سے شاہِ بحر و بر   تو کسی صورت نہ ترکِ فقیر کر
سوز اس کا خفتہ تیری جاں میں ہے   تیرے آبا سے ہے یہ دیرینہ ہے
کچھ سوائے دردِ دوراں سے نہ مانگ   حق سے نعمت مانگ سلطاں سے نہ مانگ!
ہیں بہت مردِ حق اندیش و بصیر   ہو گئے جو فرطِ نعمت سے ضریر!
سالہا کی سیر مثلِ آفتاب   منعموں کی آنکھ میں دیکھا نہ آب
اس پہ قرباں جو ہے درویشی اساس
وائے وہ دل جو ہے یزداں ناشناس
ڈھونڈ مسلم میں نہ تُو وہ سوز و شوق   وہ یقیں وہ رنگ و بُو وہ درد و ذوق
علمِ قرآں سے ہیں عالم بے نیاز   اور صوفی گرگِ خونی، مُو دراز
خانقاہوں میں ہے گرچہ ہا و ہو   ہے مئے حق سے مگر خالی سبو
یہ مسلمانانِ افرنگی مآب   سمجھے ہیں کوثر اسے جو ہے سراب
ناشناسِ سرِ دیں ہیں سب کے سب   اہلِ کیں ہیں اہلِ کیں ہیں سب کے سب
خواص میں ہے خیر اور خوبی حرام   بہرہ ور صدق و صفا سے ہیں عوام
کر تمیزِ اہلِ دین و اہلِ کیں   ہم نشینِ حق کا ہو تُو ہم نشیں
کرگسوں کا رسم و آئیں اور ہے
سطوتِ پروازِ شاہیں اور ہے
مردِ حق کا وار ہے مانندِ برق   اس کا ایندھن شہر و دشتِ غرب و شرق
ہم ہیں محصورِ ظلامِ کائنات   وہ شریکِ اہتمامِ کائنات
وہ کلیم اور وہ مسیحا، وہ خلیل   وہ محمدؐ، وہ کتاب اور جبرئیل
وہ ہے مہرِ کائناتِ اہلِ دل   اس کی ضو سے ہے حیاتِ اہلِ دل
اپنی آتش میں جلائے گی تجھے   پھر شہی کے گر سکھائے گی تجھے
سوز سے اس کے ہی صاحب دل ہیں ہم   ورنہ یکسر نقشِ آب و گل ہیں ہم
یہ زمانہ جس میں تُو پیدا ہوا   غرقِ تن ہے جاں سے ہے ناآشنا
جب بدن ارزاں ہوں اور ہو قحطِ جاں   رہتے ہیں مردانِ حق خود میں نہاں
کارگر ہوتی نہیں ہے جستجو   گرچہ مردِ حق کھڑا ہو رُوبرو
تو مگر ہر آن رکھ ذوقِ طلب   گرچہ ہوں درپیش صد رنج و تعب
گر نہ تجھ کو قربِ مردِ حق ملے   جو ملا ہے مجھ کو آباء سے وہ لے
پیرِ رومی کو رفیقِ رہ بنا   تاگدازو سوز دے تجھ کو خدا
ہے اسے معلوم فرقِ مغز و پوست   نقشِ پا اس کا ہے شمعِ کوئے دوست
ہوں معانی اس کے کیونکر دل نشیں   ترجماں اس کے اسے سمجھے نہیں
مثنوی ہے رقصِ تن کا حاصل کیا   رقصِ جاں سے ہیں مگر ناآشنا
رقصِ تن گردش میں لائے خاک کو   رقصِ جاں برہم کرے افلاک کو
علم و حکم آتے ہیں رقصِ جاں سے ہاتھ   اور زمین و آسماں بھی ان کے ساتھ
فرد اس سے صاحبِ جذبِ کلیم   ملت اس سے وارثِ ملکِ عظیم
رقصِ جاں کا سیکھنا اک کام ہے   ماسوا سے جنگ عینِ اسلام ہے
حرص اور غم کا اگر ہے دل میں گھر   رقص میں آتی نہیں جاں اے پسر
ضعفِ ایمانی ہے دل گیری ہے غم   جانِ بابا؟ نیمہ پیری ہے غم

کلامِ منثور: نثر پاروں کا انتخاب

اقبال بڑے شاعر یا بڑے فلسفی نہ تھے۔ وہ مصلح بھی تھے۔ سیاسی رہنما بھی تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈر تھے۔ پنجاب صوبائی اسمبلی کے منتخب رکن بھی رہے۔ قائداعظم کو اپنا قائد سمجھتے تھے۔ گول میز کانفرنسوں میں شریک ہوتے رہے۔ سیاسی بیانات و اعلانات جاری کرتے تھے۔ پریس کانفرنس کرتے تھے۔ مشاہیر سے خط و کتابت کرتے تھے۔ سیاسی، ادبی و ثقافتی انجمنوں کی صدارت کرتے تھے جہاں تقریریں کرتے۔ مدراس میں الٰہیاتِ اسلامیہ پر چھ لیکچر دیے جو کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

ان کی تقریروں، تحریروں، بیانات، اعلانات اور خطوط میں اُن کے عقائد و افکار نثر کی صورت میں بکھرے پڑے ہیں۔ نوجوان نسل کے تعلق سے ان کے شاہکار نثر پاروں کا انتخاب یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔

> ہمیں چاہئے کہ اپنے خدا، اپنے رسولؐ، اپنے دین اور اپنی قوّتِ بازو پر بھروسا رکھ کر حاکموں سے مودبانہ حاجات طلب کریں اور بنی نوع انسان میں امن و امان قائم رکھیں، کیونکہ اسلام ہمیں شر و فساد کی ممانعت کرتا ہے۔

اگلے مسلمانوں کا نصب العین

اسلام کی تاریخ دیکھو۔ وہ کیا کہتی ہے؟ عرب کے خطے کو یورپین معماروں نے ردّی اور بے کار پتھر کا خطاب دے کر یہ کہہ دیا تھا کہ اس پتھر پر کوئی بنیاد کھڑی نہیں ہو سکتی۔ ایشیا اور یورپ کی قومیں عرب سے نفرت کرتی تھیں، مگر عربوں نے جب ہوش سنبھالا اور اپنے کس بل سے کام لیا، تو یہی پتھر دنیا کے ایوانِ تمدن کی محراب کی کلید بن گیا اور خدا کی قسم، روما جیسی باجبروت سلطنت عربوں کے سیلاب کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ یہ اُس قوم کی حالت ہے جو اپنے بل پر کھڑی ہوئی۔ ہمیں چاہئے کہ اپنے خدا، اپنے رسولؐ، اپنے دین اور اپنی قوتِ بازو پر بھروسا رکھ کر حاکموں سے مودبانہ حاجات طلب کریں اور بنی نوع انسان میں امن و امان قائم رکھیں، کیونکہ اسلام ہمیں شر و فساد کی ممانعت کرتا ہے۔ ان اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر باقی اقوام سے ربط و اتحاد بڑھائیں اور جو سیکھ سکتے ہیں، انہیں سکھائیں۔ جو سکھا سکتے ہیں، ان سے سیکھیں، اور حتی الوسع ہمارا وہ نصب العین ہو جو اگلے مسلمانوں کا تھا۔

(جلسۂ عام بیرون موچی دروازہ، لاہور: یکم فروری 1912ء)

اسلام میں جبری تعلیم

اس جلسے میں مسٹر گوکھلے کے تعلیمی بل کے جبریہ پہلو پر غور ہوگا۔ لفظ جبر سے کسی کو کھٹکا نہ ہونا چاہئے۔ جس طرح چیچک کا ٹیکہ لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے اور یہ لزوم و جبر اس شخص کے حق میں کسی طرح مضر نہیں ہو سکتا جس کے ٹیکہ لگایا جاتا ہے اسی طرح جبریہ تعلیم بھی قابلِ اعتراض متصور نہیں ہو سکتی۔ جبریہ تعلیم بھی گویا روحانی چیچک کا ٹیکہ ہے۔ اسلام میں جبر کی تعلیم موجود ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنے بچوں کو زبردستی نماز پڑھائیں۔

(جلسہ اسلامیہ کالج، لاہور: 18 فروری 1912ء)

اسلام اور اشتراکیت

میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لئے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بولشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لئے قانونِ میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرتِ انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابلِ عمل بھی ہے۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خودغرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں…… مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول سیاسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا اس سے ملتے جلتے ہوں گے۔

(مکتوب بنام روزنامہ ''زمیندار'' لاہور: 24 جون 1923ء)

قلب کی فطرت

مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔ میں نے برسوں مطالعہ کیا۔ راتیں غور و

> نسلی اور اعتقادی اختلافات میں تنگ نظری اور تعصب نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا۔ اختلافِ رائے ایک طبعی امر ہے، لیکن اس اختلاف کو اس طریقے پر رکھنا چاہئے جس طرح کہ ہمارے آباء و اجداد نے اسے رکھا۔ اس صورت میں اختلاف رحمت ہے۔ جب لوگوں میں تنگ نظری آ جاتی ہے تو یہ زحمت بن جاتا ہے۔

فکر میں گزار دیں، تا کہ وہ حقیقت معلوم کروں جس پر کاربند ہو کر عرب حضور سرورِ کائنات ﷺ کی صحبت میں تیس سال کے اندر اندر دنیا کے امام بن گئے۔ وہ حقیقت اتحاد و اتفاق میں ہے جو ہر شخص کے لبوں پر ہر وقت جاری رہتی ہے، کاش ہر مسلمان کے دل میں بھی بیٹھ جائے۔ نسلی اور اعتقادی اختلافات میں تنگ نظری اور تعصب نے مسلمانوں کو تباہ

کر دیا۔ اختلافِ رائے ایک طبعی امر ہے اس لئے کہ طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی نظر مختلف ہے۔ اسلوبِ فکر مختلف ہوتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کو اس طریقے پر رکھنا چاہئے جس طرح کہ ہمارے آباؤ اجداد نے اسے رکھا۔ اس صورت میں اختلاف رحمت ہے۔ جب لوگوں میں تنگ نظری آ جاتی ہے تو یہ زحمت بن جاتا ہے۔ مسلمانو! میں تمہیں کہتا ہوں کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو متحد ہو جاؤ۔ اختلاف بھی کرو تو اپنے آباء کی طرح۔ تنگ نظری چھوڑ دو۔ میں کہتا ہوں کہ تنگ نظری چھوڑنے سے سب اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مخالف کو بھی نرمی سے سمجھاؤ۔ قلب کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ محبت سے رام ہو سکتا ہے' مخالفت اور عداوت سے نہیں۔

(انتخابات کے سلسلے میں ایک تقریر' لاہور: 19 نومبر 1926ء)

اسلام کا عندیہ یہ ہے کہ حقیقت کا مشاہدہ مردانہ وار کیا جائے۔ اسلامی نقطۂ خیال میں یہی معراج ہے کہ مشاہدۂ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم رہے' لیکن تمرد و سرکشی کے لئے نہیں بلکہ خدمت و عبدیت کے لئے۔ مسلم کو کسی چیز میں فنا نہ ہونا چاہئے' گو یہ فنا فی اللہ ہی کیوں نہ ہو۔

مذہب اور سائنس کا تعلق

مذہب' فلسفہ' طبعیات اور دیگر علوم و فنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزلِ مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں کیونکہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنونِ حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں اور اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر پرکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی۔

قرآن کریم کے ہر صفحے پر انسان کو مشاہدے اور تجربے کے ذریعے علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور منتہائے نظر یہ بتایا گیا ہے کہ قوائے فطرت کو مسخر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک تو صاف الفاظ میں انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو ستاروں سے بھی پرے پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے۔

مسلمانوں میں فرقہ معتزلہ اور دیگر فرقوں کے درمیان جو تنازعہ پیدا ہوا تھا' وہ اس قسم کا نہ تھا جو یورپ کے روشن دماغ علما اور تاریک خیال پادریوں کے درمیان پیدا ہوا' بلکہ وہ تو ایک علمی بحث تھی جس کا موضوع محض یہ تھا کہ آیا ہمیں الہامی کلامِ ربانی کو عقلِ انسانی کے معیار پر پرکھنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔

(جلسہ' اسلامیہ کالج' لاہور: 4 مارچ 1927ء)

فنا فی اللہ بھی نہیں

حقیقت کا مشاہدہ دو طرح سے ہوتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل آیت 36 میں آیا ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــــُٔــوْلًا ۝﴾

"اور ایسی بات کے پیچھے نہ پڑو جس کا تجھے علم نہیں کیونکہ بے شک تمہارے کان' آنکھ اور دل سب کے متعلق سوال ہوگا۔"

اس آیت میں حصولِ علم کے ذریعوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ذریعہ تو سمع و بصر ہے اور دوسرا ذریعہ انسان کا قلب ہے۔ لیکن یہ نہ ہو کہ سمع و بصر کو چھوڑ کر کلی طور پر قلب کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور ایسا بھی نہ ہو کہ قلب سے غافل ہو کر یورپ والوں کی طرح بالکل سمع و بصر کے ہو رہو۔ مسلمانوں نے اپنی توجہات قلب پر مرتکز کر دیں اور سمع و بصر سے پورا کام نہ لیا۔

نظامِ عالم کی آفرینش یوں ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی نمو کے لئے یا اپنے آپ کو ظاہر و نمایاں کرنے کے لئے دنیا کو پیدا کیا۔ اس خطِ سفر کا آخری نقطہ عالمِ ظاہر ہے۔ اب حقیقت تک پہنچنے کی راہ یہ ہے کہ اس آخری نقطے سے اُلٹا سفر کیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مظاہر کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف متوجہ ہوں۔ اس کا مقصد یہ نہ ہونا چاہئے کہ انسان مشاہدۂ حقیقت کے ساتھ اپنے آپ کو فنا کر دے۔ اسلام کا عندیہ یہ ہے کہ حقیقت کا مشاہدہ مردانہ وار کیا جائے۔ اسلامی نقطۂ خیال میں یہی معراج ہے کہ مشاہدۂ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم رہے' لیکن تمرد و سرکشی کے لئے نہیں بلکہ خدمت و عبدیت کے لئے۔ مسلم کو کسی چیز میں فنا نہ ہونا چاہئے' گو یہ فنا فی اللہ ہی کیوں نہ ہو۔

(انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس: 20 اپریل 1927ء)

ہندوؤں کی ذہنیت

میں حیران ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی ذہنیت اختیار کرنے کی ہندوؤں کو کیوں ضرورت پڑی۔ مسلمان تعداد میں کم ہیں۔ اقتصادی حیثیت سے پیچھے ہیں۔ تعلیم میں پسماندہ ہیں۔ ویسے بھی بڑے بھولے بھالے ہیں۔ حکومت چکنی چپڑی باتیں کر کے انہیں آسانی سے پھسلا لیتی ہے' ہندو انہیں پھسلا لیتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ہندوؤں نے یہ ذہنیت کیوں اختیار کی اور یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ذہنیت ہے۔

(جداگانہ طریق انتخاب کے حق میں صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس میں تقریر: یکم مئی 1927ء)

تحریر کی آزادی

ذاتی طور پر میں اخبارات کی آزادی کا بہت بڑی حد تک قائل ہوں' بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں آزادی کا حامی ہوں' لیکن میں دلائل سے متاثر نہیں ہو سکتا اور آزادی اور لائسنس کو یکساں نہیں سمجھ سکتا۔ حقیقی آزادی اخلاقی ضبطِ نفس کا نتیجہ ہوا کرتی ہے..... اگر دیسی اخبارات سنسنی پھیلانے والے عنوان لکھنا چھوڑ دیں' تقریروں وغیرہ کی رپورٹ کرنے کے لئے بہتر آدمی رکھیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات کو جو کسی اور طریقے کی معاشرت میں جاذبِ توجہ نہیں ہو سکتے' فرقہ وارانہ رنگ دینے سے احتراز کرنے لگیں تو دیسی زبانوں کے اخبارات کی تعلیمی قدر و قیمت بہت بڑھ سکتی ہے۔ ایسے ملک میں جہاں عام اشخاص نقاد نہیں اور سطحی عقل رکھنے والے ہیں' ایسی احتیاط نہایت ضروری ہے۔ بہرحال اس اعلان کا مقصد اخبارات کے لب و لہجے کی اصلاح کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ اُن کی آزادی کا سلب نہیں۔

("مسلم آؤٹ لک" سے انٹرویو: 23 مئی 1927ء)

مسلمان عورتیں مسلمان قوم کی بہترین روایات کی حفاظت کر سکتی ہیں' بشرطیکہ وہ اصلاح کا صحیح اور عقل مندانہ رستہ اختیار کریں اور ترکی یا دیگر یورپین ممالک کی عورتوں کی اندھا دھند تقلید کے درپے نہ ہو جائیں۔

اُمتِ مسلمہ کا اجتماع

میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سید احمد خان نے مسلمانوں کے لئے جو راہِ عمل قائم کی تھی' وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہِ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے..... آج میں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ہونے کے زندہ رہنا ہے تو اُن کو فوری طور پر اپنی اصلاح و ترقی کے لئے پوری کوشش کرنی چاہئے اور جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹکل پروگرام بنانا

چاہئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں بعض حصے ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں آباد ہیں۔ ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے...... آج اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو ریزولیوشن پیش ہوا ہے' وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لئے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے اور وہ یہ کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کا اجتماع کبھی گمراہی پر نہ ہوگا۔

(آل پارٹیز مسلم کانفرنس' دہلی: یکم جنوری 1929ء)

ہم مسلمانوں کو چاہئے کہ فقہ کی طرف متوجہ ہوں۔ جو حقوق ملتِ اسلامیہ نے عورتوں کو دیئے ہیں' وہ اُن کے حصول پر اصرار کریں۔ شوہر' باپ' بھائی کون سیاہ دل مرد ہوگا جو آپ کو آپ کے حقوق دینے سے انکار کرے گا۔ ہمیں تو ملک میں مسلمانوں کے اندر اس قسم کی رائے عامہ پیدا کرنی چاہئے کہ جب تک یہ طے نہ پا چکے کہ آئندہ (شادی شدہ) زندگی میں عورتوں کے کون کون سے حقوق ہوں گے' اس وقت تک نکاح نہ پڑھایا جائے۔ یہ تحریک بہت زور سے شروع ہونی چاہئے۔ مسلمان عورتیں مسلمان قوم کی بہترین روایات کی حفاظت کرسکتی ہیں' بشرطیکہ وہ اصلاح کا صحیح اور عقل مندانہ رستہ اختیار کریں اور ترکی یا دیگر یورپین ممالک کی عورتوں کی اندھا دھند تقلید کے درپے نہ ہو جائیں۔

(انجمن حمایت اسلام' مدراس: 7 جنوری 1929ء)

قدامت پسند اور ترقی پسند

اس امر کے یقینی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کہ عالم اسلام میں قدامت پسند جذبات اور لبرل خیالات میں جنگ شروع ہوگئی ہے۔ اغلب ہے کہ قدامت پرست اسلام جدوجہد کے بغیر سرِ تسلیم خم نہیں کرے گا۔ اس لئے ہر ایک ملک کے مسلم مصلحین کو چاہئے کہ نہ صرف اسلام کی حقیقی روایات کو غور کی نگاہ سے دیکھیں' بلکہ جدید تہذیب کی صحیح اندرونی تصویر کا بھی احتیاط سے مطالعہ کریں' جو بے شمار حالتوں میں اسلامی تہذیب کی مزید ترقی کا درجہ رکھتی ہے۔ جو چیزیں غیر ضروری ہیں ان کو ملتوی کر دینا چاہئے' کیونکہ صرف ضروری چیزیں فی الوقت قابلِ لحاظ ہیں۔ یہ امر صحیح نہیں ہے کہ مجلسی معاملات میں قدامت پسندانہ طاقتوں کو بالکل نظرانداز کر دیا جائے' کیونکہ انسانی زندگی اپنی اصلی روایات کا بوجھ کندھوں پر اٹھا کر ارتقاء کی منزل طے کرتی ہے۔ انسان نے اپنی معاشرتی تہذیب کو تشکیل دینے کا سبق حال ہی میں سیکھا ہے' اس لئے جائز حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔

(افغانستان پر بچہ سقہ کے قبضے کے خلاف انٹرویو: 26 فروری 1929ء)

دیوارِ گریہ کی حقیقت

فلسطین میں مسلمان اور اُن کے بیوی بچے شہید کئے جا رہے ہیں۔ اس ہولناک سفاکی کا مرکز یروشلم ہے جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے۔ اس مسجد کا تعلق حضرت خواجۂ دوجہاں ﷺ کے معراج مبارک سے ہے اور معراج ایک دینی حقیقت ہے' جس کا تعلق مسلمانوں کے گہرے جذبات کے ساتھ ہے...... صدیاں گزر گئیں کہ ایک معبد تیار ہوا تھا' جسے "ہیکل سلیمانی" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ معبد مسلمانوں کے یروشلم فتح کرنے سے بہت پہلے برباد ہوگیا۔ آنحضرت ﷺ نے معراج کا ذکر حضرت عمر فاروقؓ سے فرمایا تو انہیں ہیکل یا مسجد اقصیٰ کے صحیح موقع و محل سے بھی مطلع کر دیا۔ فتح یروشلم کے بعد حضرت عمرؓ بہ نفسِ نفیس یروشلم تشریف لے گئے تو انہوں نے مسمار شدہ "ہیکل سلیمانی" کا محلِ وقوع دریافت فرمایا اور وہ جگہ ڈھونڈ لی۔ اُس وقت وہاں گھوڑوں کی لید جمع تھی' جسے انہوں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔ مسلمانوں نے جب اپنے خلیفہ کو ایسا کرتے دیکھا تو انہوں نے بھی جگہ صاف کرنی شروع کر دی اور یہ میدان پاک ہوگیا۔ عین اس جگہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی' جس کا نام مسجد اقصیٰ ہے۔ یہود و نصاریٰ کی تاریخ میں تو یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ موجودہ مسجد اقصیٰ اسی جگہ پر واقع ہے جہاں ہیکل سلیمانی واقع تھا۔ اس تشخیص کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ یہود و نصاریٰ نے اس کی زیارت کے لئے اس وقت آنا شروع کیا جبکہ یہ مشخص ہو چکی تھی۔

ترک یہودیوں کے ساتھ غیر معمولی رواداری کا سلوک کرتے رہے۔ یہودیوں کی خواہش پر انہیں مخصوص اوقات میں دیوارِ براق کے ساتھ کھڑے ہو کر گریہ و بکا کرنے کی اجازت عطا کی۔ اس وجہ سے اس دیوار کا نام ان کی اصطلاح میں "دیوارِ گریہ" مشہور ہو گیا۔ شریعت اسلامیہ کی رو سے مسجد اقصیٰ کا سارا احاطہ وقف ہے۔ جس قبضے اور تصرف کا یہود اب دعویٰ کرتے ہیں' قانونی اور تاریخی اعتبار سے اس کا حق انہیں ہرگز نہیں پہنچتا' سوائے اس کے کہ ترکوں نے انہیں گریہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

(یوم فلسطین پر صدارتی خطبہ' لاہور: 7 ستمبر 1929ء)

مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب

عزیز طلبہ! ممکن ہے کہ آپ کو یہ اندیشہ ہو کہ میں آپ کے سپاس نامے کے جواب میں ایک ناصح مشفق کی طرح آپ کو کوئی نصیحت کرنے یا بعض نکاتِ حکمت پیش کرنے لگوں گا' لیکن آپ سے فوراً اور صاف کہے دیتا ہوں کہ میرے پاس اس قسم کی پند و نصیحت کچھ نہیں' اور نہ میرے پاس کوئی نکتۂ حکمت ایسا ہے جو دوسروں کے لئے بطور دستور العمل

جس صورت میں یہ "ڈیموکریسی" آ چکی ہے اور جو بمقدار کثیر آئندہ آنے والی ہے' وہ افسوس ہے کہ میرے دل کو نہیں بھاتی۔ ذاتی طور پر میں اس "ڈیموکریسی" کا معتقد نہیں ہوں اور اسے محض اس لئے گوارا کر لیتا ہوں کہ فی الحال اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔

پیش کرسکوں۔ مگر پھر بھی میں ایک دو باتیں ایسی کہوں گا جو محض کتابی نہیں بلکہ میرے ذاتی تجربے پر مبنی ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ جب سے ہمارے تعلقات یورپ اور خصوصاً انگلستان سے قائم ہوئے ہیں' وہاں سے بہت سی چیزیں ہم تک پہنچی ہیں۔ سب سے اول چیز انگریزی لٹریچر ہے جو ہمارے بہت سے نوجوان مصنفین کے لئے تخلیقِ مضامین کا ذریعہ ہوا ہے۔۔۔۔ وہ مضامین جنہوں نے موجودہ نسل کی ذہنیت کی تشکیل و توضیح میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ دوسری بات جو ہم کو انگلستان سے ملی ہے' وہ انکار کی عادت ہے۔ میرے نزدیک یہ عادت اس ملک کے لئے بہترین نعمت ہے' جس نے واقعات کے خلاف آنکھیں بند کر لی ہیں اور مسلسل طور پر محض خیال آرائیوں سے کام لیتا رہا ہے۔ الغرض فکرِ تعقل کی عادت ہم کو انگلستان سے ملی ہے اور درحقیقت یہی وہ چیز ہے' جس کی اس وقت تمام مشرق کو ضرورت ہے۔ تیسری چیز جو انگلستان نے ہم کو دی ہے' وہ ایک مشتبہ قدر و قیمت کی چیز ہے' جس کا نام "ڈیموکریسی" ہے۔ جس صورت میں یہ "ڈیموکریسی" آ چکی ہے اور جو بمقدار کثیر آئندہ آنے والی ہے' وہ افسوس ہے کہ میرے دل کو نہیں بھاتی۔ ذاتی طور پر میں اس "ڈیموکریسی" کا معتقد نہیں ہوں اور اسے محض اس لئے گوارا کر لیتا ہوں کہ فی الحال اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ مگر خیر' اب چونکہ یہ "ڈیموکریسی" انگلستان سے آ چکی ہے اس لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ موجودہ نسلِ نوجوانان کے لئے یہ کس قدر مفید ہے۔ واضح ہو کہ "ڈیموکریسی" کے معنی صاف' علیٰ رؤس الاشہاد اور آزادیٔ بحث و تمحیص ہیں۔

ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں' وہ ہمارا انکشافِ ماضی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں۔ میں تو مستقبل کا معتقد ہوں' مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لئے ہے کہ میں حال کو سمجھوں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمۂ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں۔ چونکہ ہم جدید تہذیب و شائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں' اس لئے ہم علومِ جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے پڑے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ علومِ جدیدہ پر اصولِ استقرائی عائد کیا گیا ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو قرآن شریف نے دنیا بھر کو عطا فرمائی ہے۔ اس طریقہ استقرائی کے نتائج و ثمرات ہم کو آج نظر آ رہے ہیں۔ میں گزشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کر رہا ہوں' ہر روز تلاوت کرتا ہوں' مگر ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلم بند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس مطمحِ حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ یونیورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد پیدا کر دے گی جو مطالعۂ قرآن میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ گزشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسدِ خاکی کا مالک ہوں' میری روح ہمیشہ آپ کی خدمات کے لئے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں' وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔

(اجلاس مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین: 29 نومبر 1929ء)

قوم پرستی کا مفہوم

پہلے معلوم کرنا چاہئے کہ قوم پرستی کا مفہوم کیا ہے۔ نیشنلزم کا جو تجربہ یورپ میں ہوا' اس کا نتیجہ بے دینی اور لامذہبی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ وہی ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ رسولِ عربی ﷺ کا وہ حکم موجود ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ آج میں نسل' ذات پات اور برادری کے تمام امتیازات کو پاؤں کے نیچے کچلتا ہوں۔ تم سب مسلمان ہو' اور یہی تمہارا صحیح نام ہے۔ ہندوستان میں جس قدر اقوام ہیں' سب چاہتی ہیں کہ ان کی خصوصیات باقی رہیں' اس لئے مسلمان بھی یہی چاہتے ہیں۔ مسلمان دوسروں پر حکومت نہیں چاہتے' اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے اُن پر حکمران ہوں اور وہ ان کے غلام بنے رہیں۔ مسلمان نوجوانوں کو چاہئے کہ سب سے زیادہ قربانی کرنے کو تیار رہیں۔

مسلم نوجوانوں کو چاہئے کہ منظم ہو جائیں اور یہ کوششیں اس لئے ہیں کہ آپ گونڈ اور بھیل نہ بن جائیں۔ ابھی آپ کو ایک شدید جنگ میں قربانیاں کرنی ہیں اور وہ سرمایہ داری کی لعنت کے خلاف جنگ ہے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ اس کے لئے بھی ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار رہیں۔ اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ کوئی دوسری قوم یا انگریز اس کی دست گیری کرے گا تو وہ بدبخت ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ' ورنہ تمہیں کوئی حق نہیں کہ زندہ رہو۔

(جلسۂ عام' بیرون موچی دروازہ' لاہور: 2 مئی 1931ء)

یومِ کشمیر پر اپیل

مسلمانو! پے در پے حملے کر کے تمہارے دشمن کو اب یہ گمان ہو گیا ہے کہ مسلمان ایک مُردہ قوم ہے۔ اس گمان کو غلط ثابت کرنے کے لئے آپ کا یہ فرض ہے کہ "یومِ کشمیر" کو کامیاب بنائیں' اور دشمن پر عملاً ثابت کر دیں کہ آپ ظلم و تعدی کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔

(مسلمانانِ کشمیر پر مظالم کے خلاف: 14 اگست 1931ء)

نوجوانوں کو نصیحت

گزشتہ دس سال سے ہم اپنے اقتصادی و سیاسی فوائد کو پس پشت ڈال کر کانگریس اور ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتے رہے' لیکن اس میں ہم کو برابر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ لہٰذا اب اگر لندن (گول میز کانفرنس) میں بھی فرقہ وار اتحاد کی کوئی قابلِ اطمینان صورت نہ نکلی اور مکمل "پراونشل اٹانومی" نہ دی گئی اور مرکزی حکومت میں ان کا کافی خیال نہ کیا گیا تو مسلمانانِ ہند کو اجتماعی زندگی پر انفرادی زندگی قربان کرنا پڑے گی اور مجھے یقین ہے کہ اگر بنگال اور پنجاب کی اکثریت اور مسلمانوں کے دیگر مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو جو دستورِ اساسی بھی ہندوستان کو دیا جائے گا' مسلمانانِ ہند اس کے پرخچے اڑا دیں گے۔

سن رسیدہ نسل نے نوجوانوں کو اپنی جانشینی کے لئے تیار کرنے کا کام جیسا چاہئے تھا' ہرگز نہیں کیا۔ لہٰذا میں نوجوانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھیں اور اگر ان کو زندہ رہنا ہے تو وہ اُن قربانیوں کے لئے تیار رہیں جو ہمیشہ سے زیادہ اُن کو آئندہ دینی ہوں گی۔ (دہلی صوبہ مسلم کانفرنس: 9 ستمبر 1931ء)

اسلام کے اندرونی دشمن

اسلام کے سوا دنیا کی کوئی طاقت اس الحاد اور مادیت کا مقابلہ کامیابی سے نہیں کر سکتی جو یورپ سے نشر و اشاعت حاصل کر رہا ہے۔ مجھے اسلام کے خارجی دشمنوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ میرے خیال میں اگر کوئی خطرہ ہے تو اندرونی دشمنوں سے ہے۔

(مؤتمر عالم اسلامی' یروشلم: 14 دسمبر 1931ء)

جاوید اقبال کے نام مکتوب

میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس مسجد کے دیکھنے کے لئے زندہ رہا۔ یہ مسجد تمام دنیا کی مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے' تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو!

(9 فروری 1932ء)

☆ رات کے تارے جو اپنی چمک دمک کے لئے تاریکی کے محتاج ہیں اور جو محض روشنی کی چنگاریاں ہیں' ان کی عمر اس قدر لمبی ہے کہ انسانی عقل اس کا اندازہ کرنے سے قاصر ہے۔ پھر انسان جو قدرت کا روشن ترین ستارہ ہے' کیا ایک عارضی زندگی رکھتا ہے اور روشنی کی آسمانی چنگاریوں سے بھی گیا گزرا ہے؟ نہیں' اس کی عمر ستاروں کی عمر سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہ ایک نہ بجھنے والا چراغ ہے۔ (روزگارِ فقیر)

☆ آدمی اگر کچھ وقت کے بعد اپنے مصائب اور غم کو بھول جاتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وقت میں کوئی پوشیدہ قوت ہے جس سے وہ انسانی غموں کو پرانا کر کے فنا کر دیتا ہے۔ ہم جو مرنے والوں کو فراموش کر دیتے ہیں تو یہ فراموشی وقت کے گزر جانے کا اثر نہیں بلکہ ہماری فطرت میں ایک احساس مخفی ہے' اور وہ یہ ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا۔ اس لطیف احساس

میموں کے سائے میں....

علی بہادر حبیب اللہ یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس لوٹے تو علامہ اقبال سے ملنے کے لئے ان کی کوٹھی پر تشریف لائے۔ علامہ نے چھوٹتے ہی کہا: "کیوں بھائی ولایت سے ہو آئے؟" اس کے جواب میں انہوں نے فخریہ انداز میں جواب دیا: "میں تو آٹھ سال کی عمر ہی میں ولایت چلا گیا تھا"۔ یہ جواب سن کر علامہ اقبال کی رگِ ظرافت پھڑکی اور آپ نے مسکرا کر فرمایا: "پھر تو آپ کو یوں کہنا چاہئے تھا: ؎

میموں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں"

کی وجہ سے ہمارا غم دور ہو جاتا ہے۔ بس گزرے ہوئے عزیزوں کی طرف سے بے پروائی اور گونہ غفلت روح کے اس احساس کی وجہ سے ہے کہ ہمارے عزیز زندہ موجود ہیں۔ اگر وہ حقیقت میں فنا ہو چکے ہوتے تو یقیناً ہمارا غم کبھی ختم نہ ہوتا۔ (روز گار فقیر)

☆ زندگی میں کامیابی کا انحصار عزم پر ہے نہ کہ عقل پر! (شذرات)

☆ پندار کی تسکین میں ہمارے لئے ایک معاشی پہلو بھی ہے۔ آپ مجھے ''ہسپتال اسسٹنٹ'' کے بجائے ''سب اسسٹنٹ سرجن'' کہیں تو میں بالکل مطمئن ہو جاؤں گا' خواہ آپ میری تنخواہ میں کوئی اضافہ نہ کریں۔ (شذرات)

☆ بلند حوصلگی' عالی ظرفی' سخاوت اور اپنی روایات وقوت پر جائز فخر ایسی چیزیں ہیں جو شخصیت کے احساس کو مستحکم کرتی ہیں۔ (شذرات)

☆ کسی معاشرے میں مذہب کا سب سے بڑا امین ومحافظ عورت ہوتی ہے۔ (شذرات)

☆ اپنی حدود کو پہچانئے اور اپنی صلاحیتوں کو پرکھئے۔ پھر زندگی میں آپ کی کامیابی یقینی ہے۔ (شذرات)

☆ قومیں شعراء کے دلوں میں جنم لیتی ہیں اور سیاست دانوں کے ہاتھوں میں پلتی ہیں اور مر جاتی ہیں۔ (شذرات)

☆ ضبطِ نفس افراد میں ہو تو خاندانوں کی تعمیر ہوتی ہے' قوموں میں ہو تو سلطنتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ (شذرات)

☆ محبت اکسیر سے بڑھ کر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اکسیر ادنیٰ دھاتوں کو سونا بنا دیتی ہے لیکن محبت تمام سفلی جذبات کو خود اپنے پاکیزہ وجود میں تبدیل کر دیتی ہے۔ (شذرات)

☆ اسلام ذاتی رائے کا معاملہ نہیں ہے۔ (حرفِ اقبال)

☆ درخت جڑ سے نہیں' پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ (حرفِ اقبال)

☆ ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ (حرفِ اقبال)

☆ اسلام میں نماز باجماعت حصولِ معرفت ہی کا سرچشمہ نہیں' اس کی قدر وقیمت کچھ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ (خطبات)

☆ اگر ہم چاہتے ہیں کہ عبادت کا مقصد زیادہ کامیابی سے حاصل ہو سکے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم اسے اجتماعی شکل دیں۔ (خطبات)

☆ قرآن مجید کے نزدیک تو انسان ہونا' نام ہی اس بات کا ہے کہ ہر قسم کی سختیاں اور مصائب برداشت کئے جائیں۔ (خطبات)

☆ علم کی جستجو جس رنگ میں بھی کی جائے' عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔ (خطبات)

☆ قرآن مجید کی رُو سے کائنات میں اضافہ ممکن ہے۔ (خطبات)

☆ زندگی کا راستہ موت در موت سے گزرتا ہے۔ (خطبات)

☆ اگر انسان پہل نہیں کرتا' اپنی ذات کی وسعتوں اور گوناگوں صلاحیتوں کو ترقی نہیں دیتا' زندگی کی بڑھتی ہوئی رَو کا کوئی تقاضا اپنے اندرونِ ذات میں محسوس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر کی طرح سخت ہو جاتی ہے اور وہ گر کر بے جان مادے کی سطح پر جا پہنچتا ہے۔ (خطبات)

☆ انسانی سیرت کا تقاضا ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرے' اس میں سختی اور پختگی پیدا ہوتی جائے۔ (خطبات)

☆ تغیر وتبدل وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی آیت ٹھہرایا ہے۔ (خطبات)

☆ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے' وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیت کے اصول صرف اسلام ہی نے بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرورِ ایام سے متاثر نہیں ہو سکتی۔ (مکاتیب اقبال)

☆ آزردگی اور پریشاں خاطری مسلمان کا شیوہ نہیں۔ اسلام کی حقیقت فقر ہے۔ (مکتوباتِ اقبال)

☆ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کے شور وغوغا میں آپ کی آواز سنی جائے تو آپ کی روح پر محض ایک ہی خیال کا غلبہ ہونا چاہئے۔ مقصدِ واحد کی لگن والا شخص ہی سیاسی اور معاشرتی انقلابات پیدا کرتا ہے' سلطنتیں قائم کرتا ہے اور دنیا کو آئین عطا کرتا ہے۔ (شذرات)

☆ خدا اور شیطان دونوں انسان کو صرف مواقع فراہم کرتے ہیں اور یہ اُسی پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ان مواقع سے جیسا مناسب سمجھے' فائدہ اٹھائے۔ (شذرات)

☆ راوی کے کنارے غروبِ آفتاب کے ایک پُر اجلال منظر کے مقابلے میں آپ کے کتب خانے کا سارا حیرت انگیز کتابی علم ودانش ہیچ ہے۔ (شذرات)

☆ اگر آپ ایک بڑے کتب خانے کے مالک ہیں اور اس کی ساری کتابیں آپ کے علم میں ہیں' تو اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ امیر ہیں' یہ ضروری نہیں کہ آپ مفکر بھی ہوں۔ آپ کے بڑے کتب خانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ بہت سے آدمیوں کی فکری خدمات حاصل کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ (شذرات)

☆ ریاضی کے ایک خط میں اتنی رسائی ممکن نہیں لیکن شاعر کا ایک خطِ مصرع لامحدودیت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ (شذرات)

☆ اسلام اور عیسائیت دونوں کو ایک مشترک حریف یعنی بُت پرستی سے نپٹنا پڑا' لیکن فرق یہ ہے کہ عیسائیت نے اپنے حریف سے سمجھوتہ کر لیا جبکہ اسلام نے اسے بالکل نیست ونابود کر دیا۔ (شذرات)

☆ جس قوم میں طاقت وتوانائی مفقود ہو جائے اس قوم کا نقطہ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک توانائی ایک حسین وجمیل شے ہو جاتی ہے جبکہ ترکِ دنیا اور رہبانیت موجب تسکین۔ (اقبال نامہ)

☆ سیاست مسلمانوں میں کوئی علیحدہ شے نہیں' بلکہ خالص مذہبی نکتۂ خیال سے کچھ شے بھی نہیں۔ اور اگر کچھ ہے تو مذہب کی لونڈی ہے۔ (مکاتیبِ اقبال)

☆ میں اُس گھر کو صد ہزار تحسین کے قابل سمجھتا ہوں' جس گھر میں علی الصبح تلاوتِ قرآن مجید کی آواز آئے۔ (گفتارِ اقبال)

☆ کوئی قوم قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ ابتلاؤں میں گرفتار نہ ہو۔ (گفتارِ اقبال)

☆ اگر میری روح کے عمیق ترین خیالات کبھی پبلک پر ظاہر ہو جائیں اور وہ باتیں جو میرے دل میں پوشیدہ ہیں' کبھی سامنے آ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ دنیا میرے انتقال کے بعد ایک نہ ایک دن بالضرور میری پرستش کرے گی۔ وہ میری کوتاہیوں کو بھلا دے گی اور آنسوؤں کی شکل میں خراجِ تحسین ادا کرے گی۔ (اقبال از عطیہ بیگم)

دعائے صحت

تنظیم اسلامی لاہور (شرقی) کے ملتزم رفیق جناب میاں محمد اکرام کے بھانجے عبدالغفار بابر ہسپتال میں زیر علاج ہیں۔ قارئین سے دعائے صحت کی اپیل ہے۔

سرمایہ آپ کا —— خدمات ہماری

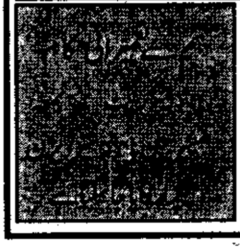

تجربہ کار ماہرین کی زیر نگرانی
تعمیراتی کام کے لئے
ہماری خدمات حاصل کریں۔
فون برائے رابطہ: 0303-6403090

مآخذ

اس خصوصی شمارے کی ترتیب وتسوید کے لئے علامہ اقبال کے تمام شعری مجموعوں کے علاوہ ان کے خطبات، تقاریر ومکتوبات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ نیز مندرجہ ذیل مقالات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے، جن کی عکسی نقول ہمیں جناب محمد سہیل عمر، ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی نے فراہم کی ہیں۔ اس خصوصی تعاون کے لئے ادارہ ان کا شکر گزار ہے۔ (مدیر ''ندائے خلافت'')

آغا یمین، ڈاکٹر	اقبال اور پاکستانی نوجوان
آفتاب حسین، سید	اقبال اور نوجوان
احمد مکرم	اقبال اور نوجوان مسلم
اختر اخلاق	اقبال اور مسلم نوجوانوں کا مثالی کردار
اسرار احمد خان، سہاروی	نونہالان ونوجوانان
اسرار احمد، ڈاکٹر	اقبال اور ہم (کتاب)
اسلم انصاری	اقبال اور نسلِ نو
انعام الحق کوثر، ڈاکٹر	نسلِ نو اور اقبال کا شاہین
بشیر ہاشمی	پیامِ اقبال اور نژادِ نو کی ذمہ داری
پرویز، غلام احمد	اقبال کا پیغام: نوجوانانِ ملت کے نام
تبسم، صوفی غلام مصطفےٰ	اقبال اور بچے
توقیر احمد خان، ڈاکٹر	نوجوان: اقبال کی شاعری میں
جاوید اختر، ایم	اقبال اور نوجوان
جاوید اقبال، ڈاکٹر	اقبال اور نژادِ نو کی ذمہ داری
جیلانی کامران، پروفیسر	اقبال کا نئی نسلوں کے ساتھ تعارف
حسن اختر، ڈاکٹر	اقبال اور نئی نسل
دوست محمد فیضی	اقبال اور مسلم نوجوان
رازی، پروفیسر	اقبال کا پیغام: نژادِ نو کے نام
رازی، پروفیسر	اقبال کی شاعری میں مثالی نوجوان کا تصور
روبینہ کوثر لودھی	اقبال اور جوانانِ ملت
ریاست علی چودھری	اقبال اور نوجوان
ساجد حسین	علامہ اقبال اور مسلم نوجوانوں کا مثالی کردار
سالک حسین، سید	اقبال اور نوجوان
سمیع اللہ قریشی	اقبال اور نوجوان نسل
سلیم، عبدالقیوم	اقبال کا پیغام نوجوان کے نام
شاہد حسین، سید	اقبال کا پیغام نوجوان نسل کے نام
صلاح الدین احمد، مولانا	اقبال کا نوجوان
طارق محمود قیصر	اقبال اور مسلم نوجوان
ظہیر الدین احمد	اقبال اور نئی پود
عقیل احمد شیخ	اقبال کے شاہین
غلام حسین، شیخ	علامہ اقبال کا پیغام: نوجوانانِ ملت کے نام
غلام علی انجم	اقبال اور نوجوان
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	اقبال اور نئی نسل
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	اقبال اور نژادِ نو
قمر دین	اقبال کا نوجوانوں سے خطاب
محمد احمد سبزواری	اقبال اور نژادِ نو
محمد جاوید بھٹی	اقبال اور نوجوان
محمد حسین خان	نوجوانوں سے خطاب
محمد روز، علامہ	علامہ اقبال اور مسلمان نوجوانوں کے کردار کی تعمیر
محمد ریاض، ڈاکٹر	اقبال اور نژادِ نو
محمد شریف بقا	اقبال اور نئی پود
محمد طارق، قاضی	اقبال اور نوجوان
مسعود گوہر	اقبال اور جدید نسل
معراج نیر، سید	اقبال: نوجوانوں کا شاعر
مظفر الحسن	اقبال اور نوجوان
منور رؤف	اقبال اور نسلِ نو
ناظر حسین زیدی، ڈاکٹر	اقبال کا پیغام نئی نسل کے نام
نبی احمد اظہر، ڈاکٹر	اقبال کا پیغام نوجوانوں کے نام
نصیر اختر	اقبال اور نوجوان
نور الحسن ہاشمی	اقبال کا نوجوان
نور الحسن ہاشمی	اقبال کا نوجوان اور اس کی تعلیم

ڈاکٹر اسرار احمد

علامہ اقبال اور ہم

پاکستان میں بسنے والا ہر مسلمان' قطع نظر اس سے کہ وہ عوام میں سے ہو یا خواص میں سے' بالکل ان پڑھ اور جاہل ہو یا عالم و فاضل' علامہ اقبال کے ساتھ سہ گانہ یہ گونہ رشتوں میں منسلک ہے۔ ایک یہ کہ یہ مملکتِ خداداد سرزمین پاکستان جس میں ہم ایک آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے رہ رہے ہیں' سب کا وجود و قیام علامہ ہی کے تخیل و تصور کا مرہونِ منت ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ عالمی ملت اسلامی اور اُمت مسلمہ جس سے ہم سب منسلک ہیں' اس کی عظمت و سطوت پارینہ کا سب سے بڑا مرثیہ خواں اور اس کے احیاء و نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا حدی خواں بھی اقبال ہی ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ دین حق جس کے ہم سب نام لیوا ہیں اور جس کے بارے میں حالی مرحوم نے کہا تھا ؎

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے — پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

اس دور میں خصوصاً جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اس دین کے اسرار و رموز کا سب سے بڑا راز دان بھی اقبال ہی ہے اور اس کی روح باطنی اور جسد ظاہری دونوں کے تجدید و احیاء کے عظیم ترین نقیب کی حیثیت بھی اقبال ہی کو حاصل ہے۔

یہ سہ گانہ تعلق تو علامہ مرحوم کے ساتھ ہر پاکستانی مسلمان کو حاصل ہے۔ مجھے ذاتی طور پر ایک چوتھی خصوصی نسبت روح اقبال سے حاصل ہے۔ مجھ پر یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو چکی ہے کہ احیائے اسلام کی شرط لازم تجدید ایمان ہے اور ایمان کا اصل منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ گویا ملت اسلامی کی نشاۃ ثانیہ اور تشکیل جدید کی کوشش ہو یا احیائے اسلام اور غلبۂ دین حق کی جدوجہد' دونوں کا اصل منبع و مدار اسی پر وابستہ ہے کہ قرآن حکیم کے ساتھ مسلمانوں کا صحیح تعلق دوبارہ استوار ہو جائے اور اس حقیقی نسبت کی تجدید کی جائے جو ایک مسلمان اور قرآن کے مابین ہونی چاہئے۔ میرے خیال میں ملتِ اسلامیہ اور دینِ حق دونوں کے احیاء اور نشاۃ ثانیہ کے قرآن حکیم کے ساتھ وابستہ ہونے کا احساس دورِ حاضر میں علامہ اقبال سے زیادہ کسی کو نہ تھا۔

علامہ اقبال بحیثیت مصورِ پاکستان

اگرچہ علامہ اقبال بنیادی طور پر سیاستدان نہ تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں جو کچھ سوچا اور ان کے مسائل کا جو حل پیش کیا وہ ان کی بیدار مغزی' معاملہ فہمی اور سیاسی تدبر کا شاہکار ہے۔ 1930ء سے قبل ہندوستان کی تقسیم کا خیال تک کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ یہ صرف علامہ مرحوم کی نگاہِ دوررس و دُور بین تھی جس نے حالات کے رخ اور زمانے کی رفتار کو پہچان کر مسلمانانِ ہند کے جملہ مسائل کا یہ حل بتایا کہ ہندوستان کے کم از کم شمال مغربی گوشے میں واقع مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل مسلمانوں کی ایک آزاد اور خود مختار مملکت قائم کی جائے۔

پاکستان کے ساتھ علامہ کا تعلق صرف ''مصور'' کا ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کی نگاہِ دُوررس نے مسلمانانِ ہند کے قومی مقدمے کی پیروی اور ان کی قیادت عظمیٰ کے لئے صحیح ترین وکیل اور قائد کی حیثیت سے محمد علی جناح کو ڈھونڈ نکالا۔ قائداعظم کا انتخاب بلاشبہ علامہ اقبال کے خلوص و اخلاص کا واضح ثبوت اور ان کے انکسار اور تواضع کی روشن دلیل ہے۔ علامہ اقبال نے صرف پاکستان کا تصور ہی پیش نہیں کیا بلکہ اس خاکے میں رنگ بھرنے کی عملی جدوجہد کے ابتدائی مراحل میں بھی قائدانہ حیثیت سے شرکت کی۔

اس اعتبار سے علامہ کا ایک عظیم احسان ہر اس مسلمان کی گردن پر ہے جو پاکستان کی فضا میں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سانس لے رہا ہے۔ افسوس کہ ہم نے بحیثیت قوم پاکستان ہی کی قدر نہیں کی کجا کہ علامہ اقبال کے اس عظیم احسان کو یاد رکھتے۔ کاش کہ ہم معلوم ہوتا کہ آزادی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے اور یہ مملکتِ خداداد پاکستان کا معجزانہ قیام اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے۔ اسی صورت میں ہمیں علامہ کے ذاتی احسان کا بھی کوئی احساس ہو سکتا تھا مگر ؎

وائے ناکامی کہ متاعِ کارواں جاتا رہا — کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہماری اسی ناقدری کے نتیجے میں پاکستان کا مشرقی حصہ ہم سے علیحدہ ہو گیا۔ اس دردناک حادثہ فاجعہ پر بھارت میں جس طرح خوشی منائی گئی اور اسے جس طرح ''ہزار سالہ شکست کے انتقام'' سے تعبیر کیا گیا اس سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو ہندوؤں کے بارے میں کسی حسن ظن میں مبتلا تھے۔ اگر مسز اندرا گاندھی اس نہرو خاندان کی بیٹی ہوتے ہوئے جس کی وسیع المشربی ضرب المثل ہے' یہ الفاظ اپنی زبان سے نکال سکتی ہے تو ''قیاس کن زگلستان من بہار مرا'' کے مصداق سوچنے کی بات ہے کہ فرقہ پرست اور متعصب مزاج ہندو اکثریت کو ایک بار ہندوستان میں فیصلہ کن اقتدار حاصل ہو جاتا تو اس کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوتا!

قافلۂ ملی کا حدی خواں

علامہ اقبال عالمی ملتِ اسلامیہ کے ترجمان و حدی خواں کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں۔ چنانچہ ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کا وجد آفریں ترانہ انہی کی زبان پر جاری ہوا۔

علامہ کی ملی شاعری میں مرثیہ خوانی کا رنگ بھی موجود ہے اور حدی خوانی کا نوحہ بھی۔ انہوں نے بیک وقت شبلی اور حالی دونوں کی جانشینی کا فرض ادا کیا اور ملتِ اسلامیہ کے شاندار اور تابناک ماضی کی یاد سے بھی دلوں کو گداز کیا اور اُمت مرحومہ کی موجودہ زبوں حالی کا نقشہ بھی نہایت موثر اور دل دوز انداز میں کھینچا۔

علامہ کی ملی شاعری کا مثبت اور تعمیری پہلو انہیں ملت کے دوسرے مرثیہ خوانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے ہاں صرف درد انگیز نالے ہی نہیں ہیں' انتہائی ولولہ انگیز پیغامِ عمل بھی ہے اور سب سے بڑھ کر ایک شاندار مستقبل کی خوشخبری بھی موجود ہے جس نے ''یاس'' اور ''قنوطیت'' کی ظلمت کا پردہ چاک کر کے دلوں میں اُمید کے چراغ روشن کر دیئے۔ علامہ کے اشعار میں یہ اُمید افزا پیغام رچا بسا ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اور ؎

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا　　　ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

علامہ کی ملی شاعری جغرافیے کی حدود سے بالکل آزاد ہے اوران کے اشعار کو پڑھتے ہوئے کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ ان کا قائل کبھی ایک محدود خطہ اراضی میں بسنے والے مسلمانوں کے خصوصی مسائل کے بارے میں بھی غور وفکر کرتا ہوگا۔ ذرا اندازہ تو کیجئے کہ ایک ہندی مسلمان ارضِ لاہور میں بیٹھا کہہ رہا تھا کہ ؎

تہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا　　　شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

رومیٔ ثانی

جہاں تک دینِ حق کے اسرار و رموز اور حقائق و معارف ایمانی اور علم و حکمت قرآنی کی ترجمانی کا تعلق ہے' حقیقت یہ ہے کہ اس نسبت سے علامہ رومیٔ ثانی تھے! انہوں نے مولانا روم کو اپنا شیخ تسلیم کیا اور "پیرِ رومی" کے ساتھ بحیثیت "مریدِ ہندی" ان کے مکالمات ان کے کلام کی زینت ہیں بلکہ ایک مقام پر انہوں نے اپنی اس نسبت کا ذکر فخریہ انداز میں بھی کیا ہے ؎

برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است
مثنویٔ مولویٔ معنوی ہست قرآں در زبان پہلوی

علامہ اقبال دورِ حاضر کے "ترجمان القرآن" قرار دیئے جانے کے مستحق ہیں۔

علامہ خود بھی اس کے مدعی تھے کہ ان کے اشعار پیغام قرآنی ہی کی ترجمانی پر مشتمل ہیں اور اس پر انہیں اس درجہ وثوق اور اعتبار ہے کہ انہوں نے "مثنوی اسرار و رموز" کے آخر میں "عرضِ حال مصنف بحضور رحمۃ اللعالمین" کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ اگرچہ میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو اور اگر میرے پیغام میں قرآن کے سوا کسی اور شے کی ترجمانی ہے تو اے نبیؐ آپ میرے فکر کے ناموس کا پردہ خود چاک فرما دیں اور اس چمن کو مجھ جیسے خار سے پاک کر دیں یہاں تک کہ حشر کے دن مجھے ذلیل اور رسوا کر دیجئے اور اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرما دیجئے۔

اسلام بحیثیت نظامِ زندگی　　اقبال کی نظر میں

دینِ حق کی جو تشریح علامہ اقبال کے کلام میں نظر آتی ہے اس کے بغرض تفہیم تین اجزاء ہیں اور یہ تینوں اجزاء درحقیقت ایک ہی مرکزی نکتے "نکتۂ توحید" کی شرح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ع

یہ سب کیا ہیں؟ فقط اِک نکتہ ایماں کی تفسیریں!

اوّلاً تمدنی اور معاشرتی سطح پر وحدت خالق ہی وہ اساسی تصور ہے جس سے وحدت انسانیت کا نظریہ جنم لیتا ہے جس میں مزید گہرائی وحدت آدم کے تصور سے پیدا ہوتی ہے اور نتیجتاً انسانی حریت واخوت ومساوات کے اصول مستنبط ہوتے ہیں' چنانچہ بحیثیت نظامِ زندگی کے علامہ کے کلام میں بڑی تاکید پائی جاتی ہے۔ وہ مردِ مومن کی شان میں فرماتے ہیں ؎

تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے　　　حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اسی طرح سیاسی سطح پر توحید الٰہی کے تصور سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ حاکمیت صرف خدا کے لئے ہے جبکہ عوام کی حاکمیت پر مبنی سیاسی نظام مجسم شرک اور کفر ہے۔ کتنے سادہ لیکن پُرشکوہ الفاظ میں علامہ نے فرمایا ؎

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے　　　حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری

ثانیاً حاکمیت کے بعد قومیت کا تصور سامنے آتا ہے' چنانچہ موجودہ زمانے میں وطنی قومیت کا جو تصور پوری دنیا میں رائج ہے' حیرت ہوتی ہے کہ علامہ نے اس کی بُرائی کا احساس کس شدت سے کیا اور اس شجرِ خبیثہ کی خباثت کا کس قدر صحیح اندازہ لگایا۔ سنئے اور سر دھنئے۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　　جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدہ تہذیبِ نوی ہے　　　غارت گر کاشانہ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے　　　اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے　　　اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

یہی معاملہ نظامِ معیشت کا بھی ہے۔ توحید کا اصول جس طرح حاکمیت اور قومیت کے تمام مروجہ وموجودہ تصورات کی کلی نفی کر دیتا ہے' اسی طرح اس میں ملکیت مطلقہ کے مقبولِ عام تصور کی بھی کامل نفی موجود ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر "مُلک" اللہ کا ہے تو "مِلک" بھی اللہ ہی کی ہے اور اگر زمین و آسمان اور جو کچھ ان دونوں میں ہے اس سب کا مَلِک یعنی بادشاہ اللہ ہے تو یقیناً ان کا "مالک" بھی وہی ہے۔

اقبال اور قرآن

سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ اس دور میں علامہ کی شخصیت عظمت قرآن کے ایک عظیم نشان کی حیثیت رکھتی ہے' اس لئے کہ ایک عام آدمی کا متوارث مذہبی کے طور پر قرآن مجید کو اللہ کی کتاب ماننا اور بات ہے اور ایک ایسے شخص کا قرآن پر وثوق واعتماد اور ایمان و یقین دوسری بات ہے جو فکرِ انسانی کی تمام وادیوں میں گھوم کر مشرق و مغرب کے تمام فلسفے کھنگال چکا ہو۔

اعجاز قرآن کے بے شمار پہلو ہیں جن کا احاطہ کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اس دور میں اعجازِ قرآن کا عظیم ترین مظہر یہ ہے کہ وہ کتاب جسے دنیا کے سامنے آج سے چودہ سو برس قبل حضور ﷺ نے پیش کیا تھا' آج بھی جبکہ مادی علوم انتہائی بلندی کو چھو رہے ہیں اور علم و ہنر کی دنیا میں انقلاب آ چکا ہے' نوعِ انسانی کی ہدایت اور رہنمائی کی جملہ ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے!

اس کی گواہی علامہ کی زندگی سے ملتی ہے۔ انہوں نے انیسویں صدی میں شعور کی آنکھ کھولی اور وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر علم حاصل کیا لیکن بالآخر ان کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے اور ان کی علمی پیاس کو آسودگی حاصل ہوئی تو صرف کتاب اللہ سے۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

علامہ جب قرآن کا ذکر کرتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ع "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید" کے مصداق وہ فی الواقع جمال وجلال قرآنی کا مشاہدہ اپنے قلب کی گہرائیوں سے کر رہے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ شنید نہیں' دید ہی پر مبنی ہے بلکہ بسا اوقات ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا وجود فکری کلامِ پاک کی عظمت کے بارِ گراں سے "خاشعا متصدعاً" ہوا جا رہا ہے۔ عظمتِ قرآنی کا یہ احساس وادراک ان کے ریشے ریشے میں سرایت کئے ہوئے تھا اور اس کا ہر شعر قرآن کی جلالت اور رفعت کے ترانے گا رہا ہے۔

مسلمانوں کے زوال واضمحلال کا اور اُمتِ مسلمہ کی نکبت وافلاس اور ذلت وخواری کا سبب علامہ کے نزدیک قرآن سے دوری ہے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر　　　اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

علامہ کے نزدیک اسی "کتابِ زندہ" سے اُمت کا احیاء وابستہ ہے اور اسی پر اُمت کی نشاۃ ثانیہ کا دارومدار ہے۔ گویا مسلمانوں کی حیاتِ تازہ کا انحصار حقیقتاً مسلمان ہونے پر ہے اور ان کے مسلمان ہونے کا دارومدار قرآن حکیم پر ہے۔ علامہ کے نزدیک علم نام ہے علمِ قرآنی کا اور حکمت نام ہے حکمتِ قرآنی کا اور یہی علم و حکمت قرآن ہے جو کسی کے ذہن اور قلب میں رچ بس جائے تو اس کے باطن میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے جو بالآخر ایک عالمی انقلاب کو جنم دے سکتا ہے۔ علامہ کے نزدیک ذہن کی تطہیر اور فکر کی تعمیر کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ "اسرارِ دیں" فاش کئے جائیں اور نوعِ انسانی کے سامنے "نکتہ ہائے شرع

(باقی صفحہ 85 پر)

حافظ عاکف سعید

اقبال اور دورِ ابلیسیت

آج کے سیمینار کا موضوع نہایت اچھوتا ہے یعنی ''اقبال اور دورِ ابلیسیت''۔ اس حوالے سے یہ بات اصولی طور پر نوٹ کر لیجئے کہ تخلیق آدم سے لے کر آج تک کوئی دور ایسا نہیں آیا جس میں ابلیس نے اپنی شکست تسلیم کی ہو اور وہ اپنے اس چیلنج سے دست کش ہو گیا ہو جو اس نے اللہ کو دیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس نے اپنی ہار اور شکست تسلیم نہیں کی۔ وہ مسلسل سرگرم عمل ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیت 16 میں ابلیس کے اس چیلنج کا ذکر ہے کہ ﴿...... لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ ''(پروردگار!) میں تیری صراط مستقیم پر لازماً گھات لگا کر بیٹھوں گا (اور تیرے بندوں کو تیرے راستے سے برگشتہ کروں گا)۔'' پھر اس کے لئے اس نے مہلت بھی مانگی کہ ﴿قَالَ اَنْظِرْنِیْ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝﴾ ''قیامت تک کے لئے مجھے مہلت عطا فرما۔'' سورۃ ص میں ابلیس کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ''پروردگار! تیرے جلال کی قسم ہے میں ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔'' چنانچہ ابلیس کی فتوحات کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا' ہاں وقتی طور پر نوعِ انسانی کا ایک جزوی حصہ تقریباً ہر دور میں اسے شکست دینے میں کامیاب رہا ہے' لیکن اس کی عمل واری تخلیق آدم سے لے کر آج تک کسی نہ کسی شکل میں چلی آ رہی ہے اور قیامت تک جاری رہے گی۔ تاہم یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ آج فیصلہ کن طور پر ابلیس کا غلبہ ہے اور وہ محض دنیاداروں پر نہیں بلکہ اہل مذہب اور اہل اللہ سب پر غالب ہے' الا ماشاء اللہ۔ اسی کا دوسرا نام دجالی دور ہے۔

دورِ ابلیسیت کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ ابلیسیت سے کیا مراد ہے! ابلیس کا اصل چیلنج چونکہ یہ تھا کہ میں نوعِ انسانی کو صراط مستقیم سے برگشتہ کروں گا' لہٰذا اس حوالے سے ابلیسیت کی حقیقت کو سمجھنا آسان ہے۔ جو بھی چیز صراط مستقیم یعنی آسمانی ہدایت سے ہٹی ہوئی ہو' وہ ابلیسیت کا مظہر ہے۔ خواہ اس کا تعلق فکر سے ہو یا عمل سے' نظریئے سے ہو یا عقیدے سے' انفرادی معاملات سے ہو یا اجتماعی معاملات سے' ہدایتِ ربانی سے گریز کی ہر صورت ابلیسیت ہی کی مظہر ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی معین کردہ صراط مستقیم سے متصادم کوئی بھی چیز خواہ وہ عقل و دانش کے مرعوب کن عنوان کے تحت ہو یا فلسفے اور نظریات کی صورت میں' وطن پرستی کے خوشنما عنوان سے ہو یا جمہوری آزادی کے دلفریب نعرے کی بنیاد پر' سیکولرازم کے خوش کن عنوان کے تحت ہو یا اباحیت پرستی کے پُرکشش نعرے کی صورت میں' یہ سب ابلیسیت ہی کی شکلیں ہیں۔

کلام اقبال کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے ابلیس کو غیر معمولی اہمیت دی ہے' اور اس کا سبب بھی بآسانی سمجھ میں آتا ہے۔ اقبال دورِ حاضر کے عظیم ترین ترجمان القرآن ہیں' اور قرآن مجید میں ابلیس کو غیر معمولی اہمیت دی گئی' قصہ آدم و ابلیس قرآن حکیم میں سات مرتبہ دہرایا گیا ہے' اسی کا عکس اقبال کے کلام میں نظر آتا ہے۔ سورۂ فاطر کی آیت 6 میں سختی کے ساتھ تاکید ہے ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ﴾ ''اے انسانو! یہ شیطان تمہارا دشمن ہے'' یہاں جھنجوڑا جا رہا ہے کہ یہ جو قرآن میں ابلیس کا ذکر بتکرار ہو رہا ہے اور بار بار اس کی دشمنی کا حوالہ آیا ہے' تو جان لو کہ یہ کوئی خیالی وہمی یا تخیلاتی و تصوراتی قسم کی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ﴿فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا﴾ ''تو اسے اپنا دشمن ہی سمجھو''۔ اسے اپنے رقیب کا درجہ دو اور اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاؤ۔ اسی طرح فرمایا گیا ﴿وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝﴾ ''دیکھو کہیں یہ سب سے بڑا دھوکے باز (شیطان) تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے اور فریب میں مبتلا نہ کر دے۔'' کہیں تمہاری آنکھوں پر فریب کا پردہ ڈال کر تمہیں حقائق سے غافل نہ کرنے پائے۔ اس اعتبار سے اقبال نے ابلیس کی اہمیت کو سمجھا اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کی فریب کاری کا پردہ چاک کیا۔ اقبال اپنے بارے میں خود یہ بات فرماتے ہیں کہ مظاہر کے پردے کو چیر کر وجود کی حقیقت تک ان کی رسائی تھی۔ ع ''گاہ میری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود''۔ یہ امر واقعہ ہے

> ہمیں احساس ہی نہیں کہ ابلیس کس طریقے سے
> ہماری صفوں کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے

کہ ان کی زندگی میں ایسے غیر معمولی لمحات آتے تھے۔ انہیں اللہ نے یہ خاص وصف عطا کیا تھا۔ بلاشبہ وہ حقیقت بیں نگاہ کے مالک تھے۔

ی شود پردۂ چشم پر گاہے گاہے
دیدہ ام ہر دوجہاں را بہ نگاہے گاہے

یعنی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں کہ میری آنکھ کا پردہ اتنا باریک ہو جاتا ہے اور نظر میں اتنی تیزی آ جاتی ہے کہ میں دونوں جہان ایک نگاہ میں دیکھ لیتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے جیسے اشتراکیت کا پردہ چاک کیا یہ انہی کا حصہ تھا۔ فرماتے ہیں۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا! طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اسی طریقے سے ابلیس کے ہتھکنڈوں کو بھی انہوں نے بڑی خوبصورتی سے نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے کہلوایا ہے کہ آج صوفی و ملا بھی درحقیقت ابلیسی نظام ہی کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں احساس ہی نہیں کہ ابلیس کس طریقے سے ہماری صفوں کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے۔ ابلیس کا ایک مشیر کہتا ہے۔

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج صوفی و ملا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

ابلیسیت کے مظاہر میں سب سے بڑا مظہر انسان کو اللہ کے مقابلے میں ایک باغی کی حیثیت سے لا کھڑا کرنا ہے۔ ملوکیت سے مراد کسی شخص کا یہ دعویٰ کرنا ہے کہ سیاسی حوالے سے کل اختیار اور بالادستی میرے پاس ہے' جبکہ اقبال کہہ رہے ہیں کہ۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی' باقی بتانِ آزری

اس حوالے سے ملوکیت بھی اپنی اصل کی اعتبار سے بہت بڑا شرک ہے۔ اسی طرح جمہوریت بھی' اگر وہ اسلام کی حدود سے آزاد ہو تو بہت بڑا شرک ہے' اس لئے کہ اس میں

سروری اللہ کے لئے نہیں ہے بلکہ جمہور کے لئے ہے۔ صوفی و ملا کو یہ معلوم ہی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے' اقوام عالم کس بڑے شرک میں مبتلا ہیں' شرک آج غیر محسوس طریقے پر مادہ پرستی اور وطن پرستی کی صورتوں میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ جبکہ اقبال کی نگاہ تیز نے اس بات کو دیکھا اور پہچانا۔ بلاشبہ اللہ نے انہیں "براہیمی نظر" عطا فرمائی تھی ۔

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے — ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

اس دور میں ابلیسیت کے مظاہر میں سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ ابلیس نے پورے کرۂ ارض پر فرعونیت کو ایک نظام کی صورت میں غالب کر دیا ہے۔ پہلے ابلیس عام طور پر افراد کو شکار کرتا تھا' لیکن اب چونکہ اجتماعیت کا دور ہے' لہٰذا اجتماعی اعتبار سے ابلیس نے یہ غلبہ "نیو ورلڈ آرڈر" کی صورت میں حاصل کر لیا ہے' جس کا نعرہ آج امریکہ نے لگایا ہے جو "سول سپریم پاور آف ارتھ" ہے۔ اصل کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہ نیو ورلڈ آرڈر' جیو ورلڈ آرڈر ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سب سے بڑا ابلیسی نعرہ ہے' اللہ کے خلاف سب سے بڑی بغاوت ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر دراصل فرعونیت اور قارونیت کا مجموعہ ہے' یہ بدترین استحصالی نظام ہے۔ ایسے نظام میں ایک عام انسان کا اللہ کی توحید اور اللہ کی بندگی پر قائم رہ جانا انتہائی مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔ اسی کا نام دجالیت ہے۔ احادیث کی رُو سے دجالی فتنے کے دور میں کسی شخص کا ایمان پر قائم رہنا اتنا ہی مشکل ہوگا جیسے اپنی ہتھیلی پر انگارے رکھ کر اسے برداشت کرنا۔

دوسرا کام جو ابلیس نے اس دور میں کیا ہے اور جس سے اس کی بالادستی ثابت ہوئی ہے' وہ انسان کو شرف انسانیت سے محروم کرنا ہے۔ اس کے لئے اس نے دو طریقے اختیار

آسمانی ہدایت سے ہٹی ہوئی ہر چیز ابلیسیت کی مظہر ہے

کئے ہیں۔ ایک سود دوسرے مادر پدر آزادی۔

سود کی حقیقت کو بھی اقبال نے خوب سمجھا۔ فرماتے ہیں ۔

از ربٰو جان تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ

یعنی سود خوری کے نتیجے میں انسان کا باطن تاریک اور اس کا دل اینٹ اور پتھر کی طرح ہو جاتا ہے اور سود خور شخص ایک ایسے درندے کی مانند ہے جس کے دانت اور پنجے نہ ہوں۔ سود کے ذریعے سے معیشت میں تقسیم دولت کا نظام ایسی غلط بنیادوں پر استوار ہوتا ہے کہ جس کے نتیجے میں ایک طرف دولت کا ارتکاز جبکہ دوسری طرف محرومی جنم لیتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا مظہر آج ہمارا اپنا معاشرہ ہے کہ جس کا ایک بڑا حصہ نہایت تیزی کے ساتھ غربت کی لکیر (Poverty line) سے نیچے جا رہا ہے۔ پاکستان میں رفتہ رفتہ مڈل کلاس ختم ہو رہی ہے۔ ایک طرف محرومی بڑھ رہی ہے' دوسری طرف ارتکاز دولت بڑھ رہا ہے۔ فقر کی ایک انتہا انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے جبکہ ارتکاز دولت کی صورت میں انسان کی حیوانیت اس پر غالب آ جاتی ہے اور وہ اشرف المخلوقات کی صفات سے عاری ہو کر درندے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ابلیس نے انسان کو اس کے مقام سے گرانے کے لئے جو دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے' وہ آزادی کے نام پر فحاشی اور عریانی کا فروغ ہے۔ وہ اپنے اصل کام یعنی انسان کے جسم سے لباس اتروانے اور اسے شرم وحیا کے پاکیزہ جذبات سے محروم کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج انسان اخلاقیات اور معاشرتی اقدار میں بالکل حیوان کی سطح پر آ چکا ہے۔ چنانچہ اس طرح ابلیس نے آدمی کو انسانیت کے اعلیٰ وارفع مقام سے گرا کر اپنی فوقیت کو ثابت کیا ہے۔

ایک اور حقیقت جسے اقبال نے نوٹ کیا تھا' وہ یہ کہ اس وقت ابلیس کے سب سے بڑے ایجنٹ اور آلہ کار یہود ہیں۔ جنہوں نے نہایت شاطرانہ انداز میں بینکنگ کے نظام کے ذریعے پورے یورپ کو اپنے معاشی چنگل میں جکڑ لیا ہے۔ فرماتے ہیں ۔

ایں بنوک' ایں فکر چالاک یہود
نُور حق از سینۂ آدم ربود!

چنانچہ پچھلی صدی کے اوائل ہی میں انہوں نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا کہ ع

فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے

اور وہ چیز اب بالکل عیاں ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ اُس وقت تو وہ مشاہدے پر مبنی ایک خیال تھا' لیکن وہ خیال اب واقعتاً کھل کر ایک حقیقت کا روپ دھار چکا ہے۔ یہود اور ابلیس میں جو چیز قدر مشترک ہے' اس کو اگر پہچان لیا جائے تو دور ابلیسیت کی اصلیت سمجھ میں آ جائے گی۔

ابلیس کا اصل مسئلہ کیا تھا؟ جب اسے حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے کہا کہ ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ﴾ "میں اس سے بہتر ہوں' تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا جبکہ اسے مٹی سے پیدا کیا"۔ لہٰذا میں بلند تر ہوں اور اس کو سجدہ نہیں کر سکتا۔ اس تکبر کی بنا پر وہ اپنے مقام سے گرا اور مردود اور ملعون قرار پایا۔ اس کے سینے میں آدمؑ کے خلاف حسد کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ تبھی اس نے کہا کہ میں انسانوں کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ جہنم میں خود تو جاؤں گا ہی' اس کو انسانوں سے بھی بھروں گا۔ یہ اس کا چیلنج تھا کہ انہیں بھی ساتھ لے کر جاؤں گا کہ جن کی وجہ سے میں اس مقام سے محروم کر دیا گیا ہوں۔ ع قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟ "جبریل وابلیس" کے عنوان کے تحت ایک مکالمے کے انداز میں اقبال نے بڑی خوبصورتی سے اس بات کو واضح فرمایا ہے کہ ابلیس کے نزدیک جنت سے اسے نکالے جانے کا ذمہ دار آدم ہے' لہٰذا اس کے خلاف ایک حسد اور جوش انتقام ابلیس کے دل میں موجود ہے۔ بعینہٖ یہ مسئلہ یہود کا بھی ہے۔ آنحضور ﷺ کی بعثت کے بعد وہ بھی اسی قسم کی آزمائش سے دوچار ہوئے جس سے شیطان یا عزازیل حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم ملنے پر ہوا تھا۔ یہود نے آنحضور ﷺ کو اچھی طرح پہچاننے اور یہ جاننے کے باوجود کہ یہی وہ آخری نبی ہیں جن کے بارے میں پیشین گوئیاں ان کی الہامی کتابوں میں موجود ہیں' آنحضور ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا مسئلہ بھی عصبیت' تکبر اور نسلی برتری کا تھا۔

یہود اور ابلیس میں تکبر اور حسد کی قدر مشترک ہے

بنی اسرائیل کا کہنا تھا کہ جب گزشتہ دو ہزار سال کے دوران تمام انبیاء اور رسول ہمارے قبیلے اور ہماری نسل میں مبعوث ہوئے' تمام آسمانی کتابوں کا نزول ہمارے ہاں ہوا تو اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم آخری نبی کو مان کر بنو اسماعیل کی برتری کو تسلیم کر لیں۔ چنانچہ ان کا تکبر سدِّ راہ بنا۔ پھر جب' وہ ملعون قرار دیئے گئے' مغضوب علیھم قرار پائے اور بنو اسماعیل اس عظیم منصب پر فائز کر دیئے گئے جو اس سے قبل یہود کو حاصل تھا تو حسد کی آگ ان کے سینوں میں بھڑک اٹھی۔ مسلمانوں کے خلاف یہ آگ آج بھی دہک رہی ہے۔ چنانچہ جو آخری معرکہ ہے' وہ اقبال کے نزدیک بھی اصل میں اسلام اور ابلیسیت کے مابین ہوگا۔

اس وقت پورے روئے ارضی پر ابلیس کے سب سے بڑے ایجنٹ یہود ہیں۔ اس امر میں کوئی شک نہیں ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کا نعرہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ آج امریکہ پوری طرح یہود کی گرفت اور ان کے شکنجے میں ہے۔ اس طرح پوری دنیا میں سودی نظام کو بھی یہود ہی نے رائج کیا۔ مغرب میں فحاشی اور عریانی کے فروغ میں بھی یہود کا ہاتھ ہے۔ شیطان کے اصل ایجنٹ اس وقت یہی ہیں اور قیامت سے قبل حق و باطل کا جو آخری معرکہ ہونا ہے ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

(باقی صفحہ 85 پر)

قاضی عبدالقادر

اور میں نے اقبال کو پالیا

اس وقت صحیح یاد نہیں، میں تیسری کلاس میں تھا یا چوتھی میں، ہمارے ہاں ''شہنشاہ ریڈر'' کے نام سے اردو کی کتاب تھی۔ اس کی ابتدا ہی میں بچوں کی وہ مشہور دعا تھی ؎

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری — زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

جس کے ذریعہ زندگی میں پہلی بار علامہ اقبال سے واقف ہوا۔ اس زمانہ میں اکثر میں اس دعا کو گنگناتا رہتا تھا۔ شعر سے بچپن ہی سے دلچسپی تھی، چاہے وہ سمجھ میں آئے نہ آئے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ زندگی میں پہلی بار پہلی کلاس میں اسمٰعیل میرٹھی کا جو شعر میں نے پڑھا تھا، وہ یہ ہے ؎

رب کا شکر ادا کر بھائی — جس نے ہماری گائے بنائی

ہاں تو علامہ اقبال کی نظم ''بچے کی دعا'' مجھے بہت پسند تھی۔ اس سلسلہ میں ایک بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، میں جب پڑھتا تھا کہ ؎

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے — ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

تو میرے خیال میں ''میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے'' کی بات تو اپنی جگہ ٹھیک تھی لیکن یہ بات کھٹکتی تھی کہ میرے دم سے اندھیرا کیوں ہو جائے۔ ایک سات سالہ بچے کے ذہن میں جو بات آتی تھی تو وہ یہ کہ میرے دم سے اجالا ہونا چاہئے نہ کہ اندھیرا۔ اب یہ ''دور'' کا لفظ اتنی دُور ہو جاتا تھا کہ بات پلّے نہیں پڑتی تھی۔ ایک بار ماسٹر صاحب سے جب یہ مسئلہ پوچھا تو وہ خوب ہنسے، بعض ذہین لڑکوں نے بھی قہقہے لگائے اور جب ماسٹر صاحب نے اِس ''دور'' کو قریب لاکر مطلب سمجھایا تو بچی بات ہے ہم کچھ جھینپ سے گئے کہ اتنی سی بات تھی افسانہ کر دیا تو — صاحبو! یہ تھا علامہ اقبالؒ کے کلام سے ہمارا پہلا تعارف!!

اس کے بعد نویں کلاس تک اردو کی درسی کتب میں گاہے گاہے علامہ اقبال کی نظمیں پڑھتے رہے جن میں سے زیادہ تر کا انتخاب ''بانگ درا'' سے تھا مثلاً ہمالہ، ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، ہمدردی، پرندے کی فریاد، ایک آرزو، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، ترانۂ ہندی، ترانۂ ملّی، چاند وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے بعض تو میرے لئے بڑی سبق آموز واقع ہوئیں اور آئندہ زندگی میں رہنمائی کا کام دیا۔ ''ہمالہ'' میں یہ شعر مجھے بہت پسند آیا تھا ؎

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے — تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

''ایک پہاڑ اور گلہری'' سے یہ سبق حاصل کیا ؎

نہیں ہے چیز نکمّی کوئی زمانے میں — کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

''ہمدردی'' سے نوعِ انسان کے لئے یہ جذبہ پیدا ہوا ؎

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے — آتے ہیں جو کام دوسروں کے

آیئے اس سلسلہ میں بچپن کا ایک اور واقعہ سناؤں۔ میں پانچویں کلاس میں تھا، اُردو کا پیریڈ تھا۔ اس وقت میری عمر یہی کوئی 9 سال ہوگی۔ اسکول ہندوؤں کا تھا اور مسلمان لڑکوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ہمارے اُردو کے استاد بھی ہندو تھے۔ ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' زیرِ درس تھا ؎

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ہمارے ماسٹر صاحب نے وطن کی تعریف کرتے ہوئے بھارت ماتا کی شان میں وہ قصیدہ پڑھا کہ الاماں والحفیظ۔ صاحب، مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں کھڑا ہو گیا اور پورے اعتماد کے ساتھ کہا کہ ''جی میرا وطن تو یہ نہیں ہے''۔ سب لڑکے حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ ماسٹر صاحب کچھ کرخت آواز میں بولے ''کیا کہا، ہندوستان تمہارا وطن نہیں ہے؟'' میں نے ادب سے عرض کیا: ''جی نہیں''۔ پوچھا ''پھر کون سا ہے؟'' میں نے فوراً جواب دیا: ''عرب'' — بات یہ تھی کہ عید کارڈوں پر جب میں ہلال عید کے سائے میں کھجور کے درخت کے ساتھ ایک عرب کو اونٹ پر بیٹھے ہلال کی جانب دعا مانگتے دیکھتا تھا تو دل میں ایک عجیب سا جذبہ کروٹیں لیتا تھا، اس میں میرے لئے ایک زبردست کشش ہوتی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ماسٹر صاحب ایک لمحہ کے لئے سکتہ میں رہ گئے۔ پھر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے کہ دیکھو تم چونکہ ہندوستان میں رہتے ہو اس لئے ہندوستانی ہو جس طرح ایران میں رہنے والے ایرانی اور جاپان میں رہنے والے جاپانی کہلاتے ہیں۔ عرب تو وہ ہیں جو عربستان میں رہتے ہیں۔ لیکن میں بضد تھا کہ ہندوستانی تو ہندو ہوتے ہیں، مسلمان کیسے ہو سکتے ہیں — یہ تھے میرے بچپن کے ایک ناپختہ ذہن کے خیالات — یہ تو سالہا سال بعد کی بات ہے جب میں نے پڑھا ؎

اس دور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مسلم قومیت اور ایک آفاقی وطنیت کا یہ جذبہ جو بچپن سے ہی لاشعور میں پیدا ہو چکا تھا، مسلم لیگ کی تحریک پاکستان میں مزید پروان چڑھا اور جب میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو میں اس وقت پاکستان میں 49ء میں میٹرک کا طالب علم تھا۔ ''اردو پارے'' ہمارے کورس میں تھی جس کا حصہ نظم کا اکثر حصہ اقبالیات پر مشتمل تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ پڑھانے والا بھی، ہمیں اقبال ہی ملا۔ اقبال صاحب ہمارے کلاس ٹیچر تھے جنہوں نے بعد میں ڈاکٹریٹ کیا اور اب ایف سی کالج لاہور میں استاد ہیں۔ کلام اقبال بزبانِ اقبال۔ ہمارے استاد صاحب کو علامہ اقبال سے قلبی لگاؤ تھا، ان کے کلام سے ایک عشق تھا۔ عشق جس کے لئے اقبال نے کہا ہے ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ — عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق فقیہہ حرم، عشق امیر جنود — عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اور

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق — معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

کلام اقبال پڑھتے وقت ان کی آواز میں ایک خاص سوز و گداز پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے جب وہ ملت کے دل سے احساس زیاں جانے کا ذکر کرتے تھے تو میں ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھتا تھا' ان کی آواز میں رقت پیدا ہو جاتی تھی اور تڑپ تڑپ جاتے تھے' جب وہ پڑھتے تھے ۔

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزم کائنات تازہ ہیں میرے واردات
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

انہوں نے ہمیں کلام اقبال کا رس گھول گھول کر پلایا' انہوں نے ہمیں ایک جذبۂ جواں عطا کیا۔ اور یہ انہی کا فیض ہے کہ آج بھی جب میں ''مسجد قرطبہ'' ''ہسپانیہ'' اور ''فاطمہ بنت عبداللہ'' جیسی نظمیں پڑھتا ہوں تو حقیقت یہ ہے کہ میرا دل خون کے آنسو روتا ہے اور اشکوں کی جھڑی آنکھوں سے پھوٹ بہتی ہے اور رکنے کا نام نہیں لیتی۔ جگر تھام کر پڑھئے تو ذرا ۔

ہسپانیہ تُو خونِ مسلماں کا امیں ہے
مانند حرم پاک ہے تُو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحر میں
پھر ترے حسینوں کو ضرورت ہے حنا کی
باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں

اور

فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تری مشتِ خاک کا معصوم ہے

اور ایک جذبۂ جواں پیدا ہوتا ہے جب میں پڑھتا ہوں ''سلطان ٹیپو کی وصیت'' ۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اور ''بڈھے بلوچ کی نصیحت اپنے بیٹے کو'' ۔

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس وشت سے بہتر ہے نہ دلّی نہ بخارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِدارا
دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اور ''طلوع اسلام'' ۔

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرے ذرے کو شہیدِ جستجو کر دے

ناشکری ہوگی اگر اس ضمن میں' میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ذکر نہ کروں جن کے درس قرآن کے ذریعہ میں نے اقبال کو پالیا۔ انہوں نے بتایا کہ اقبال مصورِ پاکستان تھے' وہ قافلۂ ملی کے حدی خواں تھے۔ وہ رومی ثانی تھے۔ انہوں نے فلسفۂ خودی اور عشق الٰہی کے ذریعہ روحِ دین کی تشریح و تعبیر کی اور اپنے کلام کے ذریعہ نظام دین کی توضیح و تفسیر کی۔ وہ نہ صرف عظمتِ قرآن کے نشان تھے بلکہ واقفِ مرتبہ و مقام قرآن بھی تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ داعی الی القرآن تھے۔ ان کے ذہن کو سکون اور ان کے علم کی پیاس کی آسودگی صرف کتاب اللہ سے حاصل ہو سکی۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں

اور آج بھی روحِ اقبال ملت کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہی ہے۔

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختہ شام و سحر تازہ کریں

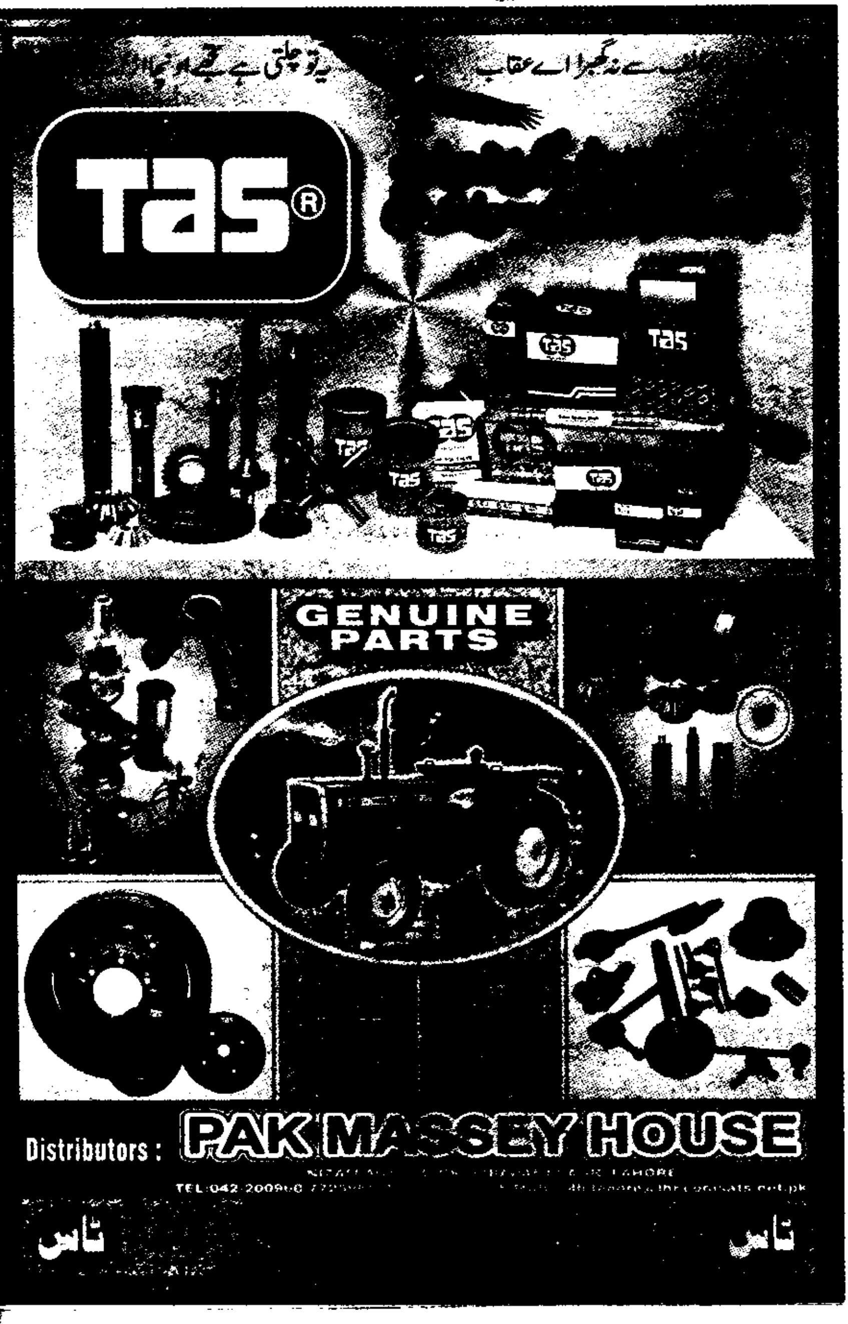

فرقان دانش خان

اقبال کے چند شعری تصورات: ایک جائزہ

ہمارے ہاں شاعری ایک رسم ورواج یا ذریعۂ تفریح کی حیثیت رکھتی ہے لیکن علامہ اقبال شاعری کو یہ پست مقام دینے کے لئے تیار نہیں۔ وہ شاعری برائے شعروادب کے قائل نہیں' بلکہ شاعر برائے زندگی ہیں اور فن برائے فن کو نہ صرف خطرناک بلکہ مہلک قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی فکر کے مقابلے میں فن کو کبھی قابل وقعت خیال نہیں کیا۔ ان کے نزدیک اصل اہمیت فکر' پیغام اور تصورات کو حاصل ہے۔ وہ شعر کی عام فنی خصوصیات پر زور دینے کی بجائے خیالات کی بلندی' ندرتِ افکار اور عملِ پیہم کا درس دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اقبال فنی اعتبار سے بھی اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

شاعر مشرق علامہ اقبال جس دور میں پیدا ہوئے اس وقت ملت اسلامیہ زوال پذیر تھی۔ سلطنت مغلیہ کا سورج غروب ہو چکا تھا اور مسلم حکومتیں یکے بعد دیگرے ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ مسلم قوم تن آسانی کا شکار ہو کر ذلت ورسوائیوں کے عمیق گڑھے میں گر چکی تھی اور اس نے انگریزوں کے پہنائے ہوئے طوقِ غلامی کو اپنا مقدر سمجھ لیا تھا۔ اقبال کے سینے میں ایک دردمند دل تھا جو مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ یہ تڑپ رفتہ رفتہ ناسور بن گئی اور یہ سوز وگداز اور غم والم ان کی زندگی کا سرمایہ ٹھہرا۔ انہوں نے سوئی ہوئی قوم کو جگانے اور اس کے تن مردہ میں روح پھونکنے کو اپنا مقصد حیات بنالیا۔ چنانچہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان کی عظمت ومقبولیت کی اصل وجہ ان کی شاعری ہی ہے جس نے مسلم قوم کی مُردہ رگوں میں خون کی حرارت پیدا کرنے کے لئے آبِ حیات کا کام کیا۔ اقبال کی شاعری میں جو چیز سب سے اہم اور اکسیر ہے وہ اقبال کے تصورات اور نظریات ہیں۔ اقبال کے یہ تصورات انسانی زندگی کی مثبت حقیقتوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک مؤمن اور مسلم معاشرے میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال کی شاعری کے چند تصورات کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ آج ہماری زندگیوں میں پھر وہی انقلاب برپا ہو سکے جو قیام پاکستان سے پہلے مسلمانانِ ہند کی زندگیوں میں اقبال کی شاعری کی بدولت رونما ہوا تھا۔

اقبال کا تصورِ حیات

اقبال کی شاعری میں ''تصورِ حیات'' زندگی کی ایک مثبت حقیقت کے طور پر اجاگر ہوتا ہے' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ زندگی کی جملہ کثافتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ علامہ اقبال نے جو فلسفہ حیات پیش کیا ہے اس کے لئے محسن انسانیت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سادہ زندگی کو مثال کے طور پر پیش نظر رکھا ہے۔

علامہ اقبال اپنے تصورِ حیات میں قاری کو زندگی سے فرار کی تعلیم نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک افضل یہ ہے کہ آدمی نہ صرف جہان سے متعلق رہے' بلکہ اس کو تسخیر کرنے کی قوت بھی اس میں موجود ہونی چاہئے۔ ان کے نزدیک یہ کائنات ابھی نامکمل ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اس کائنات کے لامحدود خزانوں کی تلاش کرے اور اسے مکمل کرے۔ چنانچہ فرمایا ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

علامہ اقبال اپنے اس تصور کی وضاحت میں جابجا سخت کوشی اور محنت کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی کا اصل مقصد صرف زندہ رہنا نہیں بلکہ زمانے کے غیر موافق حالات کو بدل کر انہیں اپنی ضروریات کے مطابق بنانا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ جدوجہد اور محنت زندگی کو رواں دواں رکھنے کا ذریعہ اور زندگی کا اصل مقصد ہے اور یہی جذبہ انسان کو صحابہ کرامؓ کی طرح زمانہ ساز بنا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال محنت اور جدوجہد کے ضمن میں یقین محکم اور عمل پیہم کی تلقین کرتے ہوئے زندگی کی حقیقت بتاتے ہیں ؎

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
یقیں محکم' عمل پیہم' محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں

شاعر مشرق نے ہمیں حرکت وعمل کا جو تصور حیات دیا ہے' وہ نہایت وسیع اور اقبال کی شاعری کے جن تصورات کی آگے تشریح کی جارہی ہے وہ بیک وقت اقبال کے تصورِ حیات میں کارفرما ہیں۔

اقبال کا مَردِ مؤمن

اقبال کا مَردِ مؤمن وہ کامل انسان ہے جسے ہر زمانے میں پانے کی خواہش کی گئی ہے اور جس کے کردار کے خاکے کئی مفکرین نے پیش کئے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال کا مَردِ مؤمن ایک جرمن فلاسفر نطشے کے تخلیق کردہ کردار سپرمین (super man) سے ماخوذ ہے' لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ نطشے کا سپرمین جنگِ عظیم میں انسانی تباہ کاریوں کے ردعمل کے طور پر محض ایک تصوراتی کردار ہے' جو صرف اور صرف جسمانی طاقت وقوت کا مظہر ہے اور فراست وتکبر اس کے اعلیٰ ترین جوہر ہیں۔ گویا نطشے کا سپرمین انتہاپسندی' سیاسی اقتدار اور نسلی امتیاز کی پیداوار ہے اور ہر قسم کی اخلاقی اقدار کی نفی کرتا ہے۔ جبکہ اقبال کے ہاں یہ تصور بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے مَردِ مؤمن کو قرآنی آیات کے سانچے میں ڈھال کر اسے کردارِ محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کا پرتو دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا مَردِ مؤمن جہاں مادی دنیا کی بڑی سے بڑی قوت کو تسخیر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے' وہاں اپنے زورِ بازو سے حاصل شدہ چیز کو دوسروں کی خدمت اور بھلائی کے لئے وقف کر دینے کی صفت بھی رکھتا ہے۔ اقبال مؤمن کی تعریف میں رقم طراز ہیں ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

یہ وہ مقام ہے جہاں اس مَردِ کامل کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ اسی تصور کو اقبال

نے نہایت حسین پیرایہ میں اس طرح پیش کیا ۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

اقبال کے نزدیک جب مردِ مؤمن میں خدائی صفات کا پرتو پایا جاتا ہے تو اس میں قہاری، غضب اور غفاری و درگزر کی صفات بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ ان عناصر کے بغیر حقیقی مسلمان نہیں بنتا۔ فرمایا ۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

لیکن یہاں یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اقبال کا مردِ مؤمن صرف غیض و غضب کی علامت ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ رحم اور لطف و کرم کی صفات بھی اس میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ علامہ اقبال کے نزدیک ۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

اقبال کا مؤمن تند مزاج نہیں ہوتا۔ دنیا کی کوئی بات اس کی نظر میں مشکل نہیں ہوتی۔ زندگی کے حادثات کو وہ صبر و تحمل سے برداشت کرتا ہے۔ وہ کسی کا ممنونِ احسان ہونا پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک قابل سپہ سالار کی طرح اپنے محدود وسائل کو نہایت دور اندیشی سے استعمال کرتا ہے۔ اقبال پاکبازی، نرم مزاجی اور سخت کوشی کو بھی انسانِ کامل کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ۔

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اقبال کا مردِ کامل روح کی اعلیٰ قوتوں کا منبع بھی ہے۔ وہ ایمان و یقین کی بدولت مادہ پر قابو رکھتا ہے۔ اس کے کردار کا جوہر نہایت درخشاں ہے۔ اس کی قوت مادی کائنات کو مسخر کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ قوموں کی تقدیریں اس کی نگاہوں کے اشارے سے بنتی ہیں ۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

اقبال کا تصورِ ملت

انگریزی زبان میں ملت یا قوم کے مترادف ایک لفظ نیشن (nation) ہے لیکن انگریزی لفظ نیشن اقبال کے ہاں ملت کا بدل نہیں ہے کیونکہ مغرب کے تصور کے مطابق قوم رنگ، نسل، زبان یا علاقائی درجہ بندی سے ظہور میں آتی ہے جبکہ مسلم ملت میں یہ امتیاز نہیں۔ مسلمان دنیا کے کسی خطے میں رہتا ہو، کوئی زبان بولتا ہو یا کسی بھی رنگ و نسل سے تعلق رکھتا ہو مسلم ملت یا امت کا حصہ ہے اور ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ چنانچہ اقبال کے ہاں جو تصورِ ملت جلوہ افروز نظر آتا ہے وہ صرف اور صرف اسلامی تصور ہے، جس کے مطابق مسلم ملت کی اساس دیگر اقوام کی اساس سے مختلف ہے۔ بقول علامہ اقبال ۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اقبال کا تصورِ ملت نسل پرستی اور تنگ نظری سے بالاتر ہے۔ وطن پرستی اس حد تک کہ مادہ پرستی ہو جائے، اقبال کے ہاں قابل قبول نہیں، کیونکہ یہ جذبہ آدمی کو نیچے ہی لے کر جاتا ہے، جبکہ اقبال ہر مقام پر انسان کے لئے اعلیٰ و ارفع مقام تجویز کرتے ہیں۔ یہ بات ان کے تصورِ ملت کی بھی بنیاد ہے۔

تصورِ شاہین

اقبال کی شاعری میں جن تصورات نے بلند مقام حاصل کیا ہے، ان میں شاہین کا تصور خاص اہمیت کا حامل ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اقبال کی جو شاعری ملتی ہے وہ حب الوطنی اور حسنِ تحریر کی آئینہ دار تھی۔ یورپ کے سفر کے دوران انہوں نے جن فطری اثرات کو قبول کیا، ان میں نطشے کا فلسفہ قوت و زندگی اہم ہے۔ گو اقبال کا فلسفہ قوت و زندگی نطشے کے تصور کے برعکس ہے، تاہم اقبال کی شاعری اسی طرح فکری منازل طے کرتی ہوئی ایک ایسے مقام پر آ پہنچی جہاں ان کے ذہن میں شاہین کا تصور ابھرا، جس کا حوصلہ اس کی اڑان کی طرح مضبوط اور مستحکم ہے۔ ۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

دراصل علامہ اقبال نے شاہین کو علامت کے طور پر اپنایا ہے اور ایک مسلم نوجوان کو شاہین کا درجہ دیا ہے۔ اقبال کا شاہین ایک ایسا نوجوان ہے جو مضبوط ارادے، بلند ہمت اور سخت مشقت کا عادی ہے۔ اقبال کا نوجوان شاہین کے روپ میں جن فضاؤں میں محوِ پرواز ہے وہ مغربی تصورات کی پہنچ سے دور ہیں۔ بقول اقبال ع

کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور!

اقبال نے جب شاہین کا تصور اپنایا تو شاہین کی فطرت کو درویشی، قلندری، خودداری اور بے نیازی کی اعلیٰ صفات کا رنگ دیا۔ ۔

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ!

علامہ اقبال شاہین کو جرأت مندانہ اور چست و چالاک نوجوان کے روپ میں پیش کرتے ہوئے اس کی ایک خصوصیت بتاتے ہیں ۔

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ!

اقبال کا تصورِ خودی

اقبال کے ہاں خودی احساسِ ذات کا نام ہے، جس کا مطلب ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو پہچانے اور انہیں استعمال میں لاتے ہوئے انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے وقف کر دے۔ گویا خودی سے مراد اپنی ذات اور صلاحیتوں کو پہچانتے ہوئے انہیں اجاگر کرنا ہے۔

علامہ کے نزدیک جذبۂ خودی پوری انسانی زندگی میں جاری و ساری ہے۔ اسی کی بدولت زندگی میں حرارت، تڑپ اور حرکت ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی زندگی، مسلسل حرکت اور عمل پیہم کا محرک خودی ہے۔ اسی لئے انسان ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے اور خودی کی تحقیق و تکمیل کی جستجو کسی مقام پر ختم نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال کے ہاں خودی سمندر کی مانند وسعت رکھتی ہے، فرماتے ہیں کہ ع

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں

اقبال کے نزدیک خودی کی تکمیل کا راز تین مراحل میں پنہاں ہے، یعنی اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں کہ انسان کے مردِ کامل بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تین مراحل کو طے کرے اور خود کو پستیوں سے نکال کر ایسی بلندیوں پر لے جائے جہاں خدا بھی اپنی مرضی کو اس کے ارادے پر چھوڑ دے۔ فرمایا ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

(باقی صفحہ 85 پر)

Iqbal: In the Heart of Hearts

Muhammad Sabieh Anwar
Pakistan Discussion Forum
Oxford University

MUHAMMAD IQBAL (1877-1938) was undoubtedly amongst the profoundest thinkers of the previous century. He was not an ordinary poet, but a man of Vision. Iqbal's standards are unconventional. He is difficult to understand – not because of the choice of his words, but because they carry a characteristic meaning. His poetic terminology is not new, but its meaning is indeed unique to him.

Being a devoted lover of the Prophet (PBUH) and his companions, he derives inspiration from the fountain-head of Qur'an. At the same time, in his quest to intellectually steer his nation he seeks refuge and guidance, from the Prophet (PBUH) himself. Like a submitting Muslim, he supplicates to the Prophet (PBUH) and shares his complaints with his Ultimate Master.

The savant Iqbal addresses the quintessential questions of *Life* and death. He preserves the sanctity of Life and death appears as a meager mirage in the Grand Scheme of this world – a temporary interlude in the journey. His life is a life beyond calculative measures of the yester and the morrow. The ideal life always *moves*, never comes to a stop. It subsumes worldly pleasures and is not surmounted by them. It begets, but is not begotten. For example, at many instances he assures that the difference between a Mu'min and a Kafir would be one of *Ishq*, one of *Khudi*, one of being a subjugate to the Commands of Allah and the other being a victim of the Writ of Fate. Building upon Qur'anic concepts, he talks about the actions of the capable man, becoming consummate with the desires of God.

Ishq is the main ingredient of Life and is also its driving force – the prime mover behind all universal occurences. This Iqbalic Love would make man into a creator of and victor over his own ideals, setting him into never-ending motion. Outreaching from one conquest to another, he is never subject to surcease. History is fraught with examples of *Ishq* making a difference between the right and the wrong. This *Ishq*, is distinct from *Ilm* or *Aql*. There are many junctures in one's Life, when one reaches a divergence of passages. Reason alone cannot be the sole guide in such cases. Reason will always give one a sense of fear and deprivation; it safeguards interests in life, but *Ishq* creates life, procreates life and makes it grow beyond bounds and shine beyond glitters. A life of pure reason would drear death, a life of *Ishq* will welcome it.

Iqbal is a believer in the anthropic principle. His bold dialogues with God represent his belief that *Ishq* could make man work miracles. But to the basic question as to how one could acquire this quality of zest, Iqbal provides a solution too. It is the concept he introduced of *Khudi*, of Self-Realization: seeking purpose in one's life; awakening to the idea that this world is for you; grasp upon the personal gifts bestowed upon you by God and in return "seize the day".

Khudi in turn leads to the qualities of *Faqr* – pride that never crosses the borders of conceit. *Faqr* represents Dignity and mutual respect, a state of being straight forth in the face of the vain pursuits of this little world. It is this attribute, that makes a man who is but the king of his heart's world, to turn away from princely grandeur. Moreover, Iqbal says that a man could only be dignified, if he is a *free* man. *Freedom* from all masters but one, is essential. The false hopes, fragile aspirations and misplaced desires that dwell in a slave's heart, could never grant him the virtues of *Khudi* and hence most of his value in life would simply be lost. Worshipping deities other than the Lord, either inhabiting within one's heart or without, should shatter away any hope of progress. To the Muslims of the day, these figurines are the idols of sect, territory, rites and vain customs and above all false nationhoods.

A man of *Faqr* would never sell away his fortune in search of temporary goals. He is firm and strong in action. He can never be bent in the face of peril. He does not droop low to seek sustenance. Such a man is likened to a *Shaheen*, an Eagle, whose niche is the echelons of honour and not the abysses of ignominy, like the habitat of a vulture. A nation, whose youth are armed with the double-edged sword of *Khudi*, would no longer need any weapons of mass destruction – it would be crowned with majesty.

Muhammad Iqbal pinned his hopes in the youth. *Youth* and *Hope* were again some of the themes resonating throughout his work. *Hope*, as Iqbal believed was a natural outcome of *Faqr* and *Yaqeen*. The youth were Iqbal's foremost addressees. Inculcating his Vision into the individuals of the day, as professed in the verse I have selected to be the masthead of this essay, was his prime desire.

Iqbal, being wary of the vices of modern western education, conflicted with an education that was void of *Ishq* or a recognition of *Self*. Wetern education, especially, remained a main target of his criticism.

The west never became the ideal world for Iqbal. His Inner Eye could go beyond the veils and penetrate into the flaws of the modern society. He attacked western imperialism, their portrayals of democracy, their concepts of colour and race, and their emptiness of *warmth* or *Soz*, as Iqbal coins it. He had a sip of wine from the cups of disparate civilizations – both the east, being shuddered into the wormholes of ignorance and bigotry, as well as the west, with all its signs of teeming progress. To him, the west was all glitter, with false standards, and soul-less ideals. Their lives were mere lives of humanoids, mechanically adjusting to daily needs. Iqbal's whole philosophy, on the other hand, had grown out of Purpose. Without Purpose, it would have taken to the ground in no time. Could the west contribute any purpose to life or any direction, at the least? The poet speaks of their scientific marvels – Copernicianism, Newtonianism, and Einsteinism, one after the other, and then raises the question if the self-same scientifically abler man, traversing the zodiac of galaxies, could ever resolve the complex trajectories of the ideas drifting in his own personal cosmos. Whilst capturing beams of sunlight, could he ever illuminate the dark alleys of his terrestrial barren life?

Without being a rejectionist, Iqbal also looked beyond mere romanticism with the past glory of Muslims. His vision flew him over and above the cities of Kufa and Baghdad, always waiting for new camps to be drawn, new roads to be taken and new thoughts to be aspired. He fascinates with the past to an overwhelming extent, but he does not blindly reject all that comes from the west or exhort all that is eastern.

He vehemently rejects asceticism. He arouses a constant clash between the *madrassah* and the *khanqah* – the abodes of the *mullah* and the *sufi* respectively. He does not respect the philosopher or the narrow mullah – one, he says, summons the death of the heart, and the other blindfolds the eye that looks boldly into the world. He only

متحدہ مجلس عمل کی کامیابی ـــــ ایک آزمائش

مسجد دارالسلام باغ جناح' لاہور میں بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے 18 اکتوبر 2002ء کے خطاب جمعہ کی تلخیص

قرآن حکیم میں ایک مضمون متعدد مرتبہ آیا ہے' جس کا حاصل یہ ہے کہ جو انسان حقیقت الحقائق (ذات باری تعالیٰ) سے محجوب ہوتا ہے' یعنی جس کا ذہنی و قلبی اور روحانی رشتہ اللہ کے ساتھ مضبوط نہیں ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ دنیاوی زندگی کے حوادث اور خوشیوں پر اس کا ردِّعمل بہت شدید ہوتا ہے۔ اُسے کوئی خوشی حاصل ہو جائے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے اور اگر کوئی ناکامی حاصل ہوتی ہے تو بجھ کر رہ جاتا ہے اور ہمت گنوا بیٹھتا ہے۔ جبکہ بندۂ مومن ان تغیرات سے زیادہ متاثر نہیں ہوتا کیونکہ اس کی نگاہ حقائق پر ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر جو جتنا ایمان سے قریب تر ہے وہ اتنا ہی مضبوط ہوتا ہے۔ تھوڑا بہت اثر تو انسان پر فطری اور طبعی طور پر ہوتا ہے جیسے آنحضرت ﷺ کی آنکھوں سے بھی اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیمؑ کے انتقال پر آنسو جاری ہو گئے تھے اور جب کچھ لوگوں نے پوچھا کہ حضور ﷺ آپ کی آنکھوں میں بھی آنسو ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کی طرف سے جو رحمت ہمارے دل میں ڈالی گئی ہے یہ اس کا ظہور ہے ورنہ ہم اپنی زبان سے یہی کہتے ہیں کہ جو اللہ کا فیصلہ ہے ہم اس پر راضی ہیں۔

بہرحال جو ایمان میں زیادہ مضبوط ہو گا وہ اتنا ہی زیادہ مضبوط ہو گا۔ اسی کو قرآن پاک میں "نفس مطمئنہ" کہا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الفجر میں فرمایا گیا:

"اے نفس مطمئن اپنے رب کی طرف لوٹ' اس حال میں کہ تو اس سے اور وہ تجھ سے راضی ہے۔ پس شامل ہو جا میرے خاص بندوں میں اور میری جنت میں داخل ہو جا"۔

اب ذرا چند مثالوں کے ذریعے دیکھئے کہ قرآن مجید میں کس کس طور سے اس مضمون کو بیان کیا گیا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا:

"جب ہم انسان پر اپنی نعمتوں کی بارش کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا ہے اور تکبر اختیار کرتا ہے اور جب تکلیف پہنچتی ہے تو مایوس ہو کر رہ جاتا ہے"۔

اسی طرح سورۃ الشوریٰ میں فرمایا:

"ہم جب انسان پر رحمت کرتے ہیں تو خوشیاں مناتا ہے اور اگر تکلیف آجاتی ہے تو نہایت ناشکری کرتا ہے"۔

سورۂ ہود میں فرمایا:

"پہلے ہم انسان کو اپنے پاس سے رحمت کا مزا چکھاتے ہیں اور پھر وہ اس سے سلب کر لیتے ہیں تو وہ مایوس اور نہایت ناشکرا ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کی تکلیف کو ختم کر کے پھر رحمتوں کی بارش کرتے ہیں تو کہتا ہے میری ساری تکالیف دور ہو گئیں اور نہایت اترانے والا بن جاتا ہے"۔

یہ مضمون اپنے عروج (Climax) پر سورۃ الفجر میں آیا ہے:

"انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا رب اسے آزماتا ہے اور اسے نعمتیں اور دنیوی عزت دیتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دی اور جب اس انسان کو اللہ روزی تنگ کر کے آزماتا ہے تو کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز ایسا نہیں ہے....."۔ (آیت 15 تا 17)

سوچنے کی بات ہے کہ آخر اس میں خرابی کیا ہے؟ یہ انسان توحید کے اس مقام پر تو پہنچ چکا ہے کہ اپنی دونوں حالتوں یعنی عزت و ذلت کو خدا ہی کی طرف منسوب کر رہا ہے پھر اس کے طرزِ عمل کو غلط کیوں کہا گیا؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ دنیا کی عزت کو کامیابی اور یہاں کی ذلت کو اپنی رُسوائی سے تعبیر کر رہا ہے۔ جبکہ یہاں کی عزت' عزت نہیں اور ذلت' ذلت نہیں۔ بلکہ یہ دونوں حالتیں آزمائش ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اس دنیا میں کبھی کچھ دے کر اور کبھی چھین کر آزماتا ہے۔ ہمیں ان دونوں حالتوں کو آزمائش ہی سمجھنا چاہئے۔ اصل عزت اور ذلت کا فیصلہ تو قیامت کے دن ہونا ہے۔

سورۂ فجر کی ان آیات کا معاملہ تو اسی حد تک ہے لیکن اس سے آگے بھی معرفت اور حقیقت کی ایک گہرائی ان آیات میں پنہاں ہے۔ وہ یہ کہ عام طور پر انسان سمجھتا ہے کہ دولت اور عزت ہلکی آزمائش ہے جبکہ فقر و فاقہ کی آزمائش زیادہ سخت ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ جو حقیقت سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے فراوانی حاصل ہے تو شدید اندیشہ ہے کہ غفلت طاری ہو جائے جبکہ تکلیف اور فقر و فاقہ میں اللہ یاد رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا" اگر تمہارے پاس دنیوی ساز و سامان کم ہو لیکن کفایت کر رہا ہو تو یہ کہیں بہتر ہے اس سے کہ بہت کثیر ہو جائے اور غافل کر دے"۔

اس کی ایک روشن مثال ہماری تاریخ میں موجود ہے۔ دورِ بنو اُمیہ میں علم الکلام کا ایک مسئلہ کھڑا ہوا تھا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ حکومتی سطح پر اسے مخلوق مان لیا گیا تھا اور علماء پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ بھی اس بات کو مان لیں۔ علماء کی ایک بڑی تعداد نے دباؤ میں آ کر تسلیم بھی کر لیا تھا۔ لیکن امام احمد بن حنبلؒ چٹان کی طرح کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کہا میں اسے ہرگز مخلوق قرار نہیں دے سکتا۔ ہاں اگر کتاب یا سنت سے کوئی دلیل ہے تو لاؤ' میں مان لوں گا۔ اس پر وہ گرفتار کئے گئے۔ انہیں مارا پیٹا گیا اور سخت تکالیف پہنچائی گئیں۔ لیکن کبھی آپؒ کی آنکھ میں آنسو نہیں آئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ خلیفہ مر گیا اور دوسرا خلیفہ برسر اقتدار آیا تو اُس نے یہ صورت ختم کر دی اور امام احمد بن حنبل کو رہا کر کے ان کے گھر قاصد کے ذریعے اشرفیوں کی تھیلی بھیجی۔ اس پر آپؒ رو پڑے اور کہا "اے اللہ میں اس امتحان کے قابل نہیں ہوں یہ امتحان قید و بند کے امتحان سے زیادہ سخت ہے"۔

اصل میں عارف چونکہ حقائق کا جاننے والا ہوتا ہے لہٰذا اس کا معاملہ عام انسانوں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ وہ خوشحالی و فراوانی کی آزمائش کو تنگی کی آزمائش سے سخت جانتا ہے۔

میں نے آج ساری گفتگو متحدہ مجلس عمل کی حالیہ انتخابات میں کامیابی کے تناظر میں کی ہے۔ متحدہ مجلس عمل کی یہ شاندار کامیابی غیر متوقع بھی ہے اور غیر مترقبہ بھی۔ لیکن جتنی بڑی یہ کامیابی ہے اتنا ہی بڑا امتحان بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کو جتنا زیادہ نوازتا ہے اس کی مسئولیت بھی اسی اعتبار سے بڑھ جاتی ہے۔

متحدہ مجلس عمل کے لئے اس امتحان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کا حقیقی شکر ادا کریں اور تواضع کا مظاہرہ کریں۔ نیز انہیں یہ احساس بھی ہونا چاہئے کہ اللہ نے ایک بہت بڑے امتحان سے دوچار کر دیا ہے۔

ایسے موقع پر شکر اور تواضع کی مثال سیرت مطہرہؐ سے ملتی ہے کہ جب آپؐ فتح مکہ کے دن مکہ میں داخل ہوئے تو

آپؑ کی گردن اتنی جھکی ہوئی تھی کہ آپؑ کی پیشانی سواری کی گردن کے بالوں کے ساتھ لگ رہی تھی۔

اسی طرح سورۃ الاعراف میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے بنی اسرائیل نے جب کہا کہ اے موسیٰؑ آپؑ کے آنے سے پہلے بھی ہم پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے اور آپؑ کے آنے کے بعد بھی وہی صورت ہے۔ آپؑ کی بعثت سے ہماری حالت میں کون سی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اس پر آپؑ نے جو جواب دیا وہ قرآن میں نقل کیا گیا ہے کہ:

''قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور زمین میں تمہیں خلافت عطا کر دے' پھر وہ دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو''۔

بعینہٖ متحدہ مجلس عمل بھی ﴿فینظر کیف تعملون﴾ کے امتحان سے دوچار ہے۔ ان کا سب سے کٹھن اور کڑا امتحان سرحد میں ہے جہاں ان کی بلاشرکت غیرے (Exclusive) حکومت قائم ہوگی۔ لہٰذا انہیں چاہئے کہ دستور پاکستان میں صوبوں کو جو اختیارات حاصل ہیں اسلام کے حق میں بھرپور انداز میں بروئے کار لائیں اور ازروئے قرآن' نماز اور زکوٰۃ کا حقیقی نظام قائم کریں' نیکی کا حکم دیں اور بدی سے روکیں۔ چنانچہ صوبہ سرحد میں نماز کے اوقات میں کاروبار کا بند کیا جانا اور زکوٰۃ کے حقیقی نظام کی تنفیذ کے نتیجے میں کفالت عامہ کا انتظام ہونا چاہئے تاکہ وہاں کوئی ضرورت مند بھیک مانگتا نظر نہ آئے۔ مجلس عمل نے اگر یہ نہیں کیا تو ان کی حالیہ کامیابی بے معنی (Counter productive) ہوجائے گی۔

متحدہ مجلس عمل کا یہ فیصلہ کہ انہوں نے صوبۂ سرحد کا نام بدلنے کے عزم کا اظہار کیا ہے میرے نزدیک درست ہے۔ کیونکہ ''شمال مغربی سرحدی صوبہ'' (N.W.F.P) غیر منطقی نام ہے ویسے بھی پاکستان کے چاروں صوبے ہی سرحدی ہیں۔ لہٰذا صوبہ سرحد کی ثقافت وروایت کے مطابق اس کا نام رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ ایک زمانہ تھا جب اس صوبے کا نام پختونستان رکھنے کے لئے دباؤ ڈالا جارہا تھا تو وہ پختون نیشنل ازم کی بنیاد پر تھا۔ جبکہ اب ظاہر ہے کہ یہ پختون نیشنلزم کی بنیاد پر نہیں بدلا جارہا۔ اسی طرح جمعہ کی چھٹی کا فیصلہ بھی ایک اچھی روایت ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ فحاشی' بے حیائی اور بے پردگی کے خلاف کام کیا جائے اور ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ مجلس عمل کے بعض لیڈروں کا یہ طرز عمل کہ ہم طالبان والا اسلام یہاں نافذ نہیں کریں گے' قابل افسوس ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کی کامیابی میں دینی عناصر کے اتحاد کی برکت کے علاوہ شہدائے افغانستان کے خون کا صدقہ بھی شامل ہے۔ جہاں تک طالبان حکومت کا تعلق ہے اگرچہ انہیں اسلامی نظام کے قیام کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن قانون اسلامی کی تنفیذ اور قرآن وسنت کی بالادستی کے باعث وہ یقیناً ایک اسلامی حکومت تھی۔ اسی طرح طالبان نے سادگی اور تواضع کی جو مثال قائم کی ہے اس میں بجا طور پر خلافت راشدہ کا ایک عکس دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا مجلس عمل کو طالبان کے ساتھ اپنے تعلق پر کسی احساس کمتری کے بجائے صوبہ سرحد کی حد تک طالبان کے ان اسلامی اصولوں کو ضرور اپنانا چاہئے جنہیں دستور کے اندر رہتے ہوئے کسی صوبے میں بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ البتہ جن معاملات میں طالبان کے طرز عمل میں اصلاح کی گنجائش موجود تھی' انہیں بدلنے میں کوئی حرج نہیں۔ مثلاً داڑھی کے معاملے میں بہت زیادہ شدت اختیار کرنے کے بجائے ترغیب وتشویق کا معاملہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ البتہ پردے کا معاملہ دوسرا ہے' اس کے لئے اسلامی تعلیمات کے مطابق قانون بنایا جانا چاہئے۔ اسی طرح انتخابات سے قبل سرحد میں دینی رہنماؤں نے کیبل آپریٹرز اور ڈش انٹینا کے خلاف مہم چلائی تھی کیونکہ یہ چیزیں دور حاضر میں فحاشی کے فروغ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ اب چونکہ ان دینی جماعتوں کو وہاں اختیار حاصل ہوگا لہٰذا ان چیزوں پر پابندی لگنی چاہئے۔ مختصراً یہ کہ انہیں جو اختیار حاصل ہوا ہے اسلامی معاشرتی اقدار اور آداب کے نفاذ کے لئے بھرپور طور پر استعمال کیا جائے۔ اس ضمن میں بیرونی دنیا کے کسی دباؤ کو خاطر میں نہ لایا جائے اور نہ ہی کوئی معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا جائے۔ اگر مجلس عمل نے ایسا نہ کیا تو انہیں اللہ اور عوام دونوں کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔

اسی طرح میری ایک تجویز ہے کہ صوبہ سرحد کے وزراء سادگی اختیار کرنے کے ضمن میں اپنی تنخواہ آدھی کرنے کے ساتھ اپنی مراعات کم سے کم کر دیں اور چھوٹی گاڑیاں استعمال کر کے دوسرے صوبوں کے لئے مثال قائم کریں۔ صرف اسی صورت میں متحدہ مجلس عمل اس آزمائش میں کامیاب ہوسکتی ہے۔ بصورت دیگر ان کی ناکامی نہ صرف ملک میں اسلام کے حوالے سے خطرناک نتائج کی حامل ہوگی بلکہ ملک کے بقاء واستحکام کے لئے بھی نقصان دہ ہوگی۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

جہاں تک مرکز کا معاملہ ہے متحدہ مجلس عمل کو وفاق میں حکومت سازی کے لئے جوڑ توڑ کی سیاست اختیار نہیں کرنی چاہئے کیونکہ حکومت میں شمولیت کے بعد بہت سے اعتبارات سے لچک دکھانی پڑے گی جس کے باعث ''اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی'' کے مصداق یہ دینی عناصر عوام میں اپنی وقعت کھو دیں گے۔ موجودہ حالات میں ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ اپوزیشن میں بیٹھ کر نفاذ اسلام کے لئے پریشر گروپ کے طور پر کام کریں اور روایتی اپوزیشن کے بجائے اصولی اپوزیشن کا کردار ادا کریں یعنی حکومت کا کوئی عمل یا پالیسی اگر درست ہو تو اس کی تائید کریں اور اگر وہ غلط راہ اختیار کریں تو ان پر تنقید کریں اور ان کا ساتھ نہ دیں۔

یہ بات بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ جاگیردارانہ نظام اور فرقہ واریت کے ہوتے ہوئے انتخابات کے ذریعے یہاں اسلامی نظام کا قیام ممکن نہیں۔ جیسا کہ سود کے معاملے میں ہوا کہ تیس سال کی مساعی کو بیک جنبش قلم صفر کر دیا گیا۔ یہاں اسلام کے عادلانہ نظام اجتماعی کا قیام صرف محمدی انقلاب کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ لہٰذا دینی جماعتوں کی انتخابات میں کامیابی کے نتیجے میں نفاذ اسلام کے بارے میں زیادہ پرامید نہیں ہونا چاہئے۔ تاہم اگر یہ حضرات ملک کو سیکولرازم کی طرف جانے سے روک سکیں تو یہ بھی بہت بڑی بات ہوگی OO

ان شاء اللہ اس سال ماہِ رمضان المبارک کے دوران

قرآن اکیڈمی

36۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور میں

دورۂ ترجمہ قرآن حکیم

کی سعادت

ڈاکٹر عارف رشید

حاصل کریں گے۔

☆ جامع مسجد قرآن اکیڈمی میں نمازِ عشاء ٹھیک ساڑھے سات بجے ادا ہوگی۔

☆ خواتین کی شرکت کے لئے خصوصی اہتمام ہوگا۔

پاکستان کا سیاسی منظر نامہ اور متحدہ مجلس عمل

مسجد دارالسلام باغ جناح' لاہور میں بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے 25 اکتوبر 2002ء کے خطاب جمعہ کی تلخیص

ہمارے ملک میں سیاسی گہما گہمی سے جو چیز برآمد ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ مرکز میں بالآخر مسلم لیگ (ق) اور پیپلز پارٹی کی مشترکہ حکومت بنے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرکز میں فارن پالیسی کے حوالے سے امریکہ کے ساتھ موجودہ حکومت کے گٹھ جوڑ کا جو معاملہ ہے اس میں ان دونوں جماعتوں کا نقطہ نظر ایک ہے یعنی دونوں امریکہ کی یکساں پرستار ہیں۔ اسی طرح عالمی مالیاتی اداروں سے مراعات کے سلسلے میں بھی ان دونوں کی پالیسی ایک جیسی ہے۔ مسلم لیگ (ق) تو پرویز مشرف کی پاکٹ لیگ ہے ہی اس لئے جو پالیسی مشرف کی ہے وہی ان کی ہو گی۔ جبکہ بے نظیر بھٹو نے بھی پچھلے دنوں امریکہ کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلانے کی حتی الامکان کوشش میں پرویز مشرف کی صد فی صد نہیں بلکہ دو سو فیصد تائید کی ہے۔ چنانچہ یہ سارے عوامل اس بات کے غماز ہیں کہ کچھ چھوٹے گروپوں کو ساتھ ملا کر مرکزی حکومت بالآخر ان دونوں بڑی جماعتوں کی ہی بنے گی۔

جہاں تک وزارتِ عظمیٰ کا تعلق ہے اگر مرکز میں صرف مسلم لیگ (ق) کی حکومت بنتی تو وزیراعظم کا قرعہ فال غالباً فاروق لغاری صاحب کے نام نکلتا۔ لیکن اگر پیپلز پارٹی کے ساتھ معاملہ ہوا جیسا کہ نظر آ رہا ہے تو وہ کبھی بھی لغاری صاحب کو اس منصب پر پسند نہیں کرے گی۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ظفر اللہ خاں جمالی کو یہ منصب مل جائے۔ اُدھر پرویز مشرف اپنی دانست میں ریفرنڈم کے ذریعے صدارت کا حق پانچ سال تک محفوظ کرا ہی چکے ہیں۔ لہٰذا صدر وہی رہیں گے۔ اراکینِ اسمبلی اگرچہ 1973ء کے دستور کے تحت حلف اٹھائیں گے' لیکن حالیہ ترامیم کو چونکہ دستور کا جز بنا دیا گیا ہے اس لئے اور اگر انہیں نکال کر حلف لیں گے تو وہ حلف معتبر نہیں ہوگا لہٰذا ہو سکتا ہے ان چیزوں کو صرف اس لئے برداشت کر لیا جائے کہ کہیں یہ سیاسی عمل روک نہ دیا جائے۔ بہرحال اگر ایسا ہوا تو مستقبل کے سیاسی منظر نامے میں کم از کم مرکزی سطح پر بہت معمولی سا تغیر واقع ہوگا' گویا مرکزی سطح پر Status Quo کی حالت ہی برقرار رہے گی۔

البتہ اس سارے معاملے میں تشویشناک بات یہ ہے کہ متحدہ مجلس عمل بھی لیلائے اقتدار تک رسائی کے لئے کفر والحاد کے ساتھ مفاہمت' مصالحت اور مداہنت کا راستہ اختیار کر رہی ہے' جیسا کہ غیر ملکی سفیروں کی کانفرنس میں مجلس عمل کے قائدین نے اطمینان دلانے کی کوشش کی ہے کہ ہم عورتوں کے حقوق برقرار رکھیں گے۔ اگرچہ اسلام میں خواتین کے حقوق کا سب سے زیادہ خیال رکھا گیا ہے لیکن اسلام کا نام لئے بغیر عورتوں کے حقوق کے تذکرے سے مغربی تصورِ حقوق ہی مراد لیا جائے گا۔ اور جب یہ بات غیر ملکی سفیروں کے سامنے کی جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ان کے لئے اپنے آپ کو قابلِ قبول بنانے کی غرض سے آپ اسلامی تہذیب اور اصولوں کے معاملے میں نرمی اختیار کرنے کو تیار ہیں' جس کی بہرحال اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح غیر مسلموں کے حقوق کا خیال رکھنے کی بھی یقین دہانی کرائی گئی۔ اگر یہاں بھی مغربی تصور مراد ہے تو اہلِ کفر کے نزدیک تو ہر ایک کو آزادی ہے کہ وہ دوسروں کے عقائد و نظریات کے بارے میں جو لغویات چاہے بیان کرے۔ جیسا کہ عیسائی حضرت عیسیٰؑ کو گالی دینے والے یہودیوں کو گوارہ کرتے ہیں' کیونکہ ان کے نزدیک تو ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے۔ اسی لئے ملعونین سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کو نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ اور صحابیاتؓ کی شان میں گستاخی پر مغرب کی حمایت حاصل ہے۔ اگر غیر مسلموں کے ان حقوق کا خیال رکھنے کی بات کی گئی ہے تو پھر اللہ ہی حافظ ہے۔ اس کانفرنس میں قاضی حسین احمد صاحب نے مخلوط طرزِ تعلیم کے خاتمے سے متعلق اپنے ایک بیان کے بارے میں سوال پر جس طرح معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا ہے وہ بھی افسوس ناک ہے۔ اگر ان حضرات نے یہ سب کچھ کرنا تھا تو وہ کون سا اسلام ہے جسے نافذ کرنے کے لئے میدان میں آئے ہیں؟ اگر مغرب کے لئے قابلِ قبول اسلام چاہئے تو ق لیگ یا ن لیگ ہی نہیں' پیپلز پارٹی والے بھی مسلمان ہیں اور نماز روزے کے قائل ہیں۔ مغرب کو جس حد تک اسلام گوارہ ہے اس حد تک تو یہ لوگ بھی اسلام کی تنفیذ کے لئے تیار ہیں۔ اس اعتبار سے متحدہ مجلس عمل کے تحت دینی جماعتوں کا جمع ہونا تو بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

مجلس عمل کے رہنماؤں نے یہ بھی کہا ہے کہ غیر مسلم ممالک سے ہمارے جو معاہدے ہیں ان کی پابندی بھی کی جائے گی۔ اس یقین دہانی کے تناظر میں اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مغرب سے سب سے بڑا معاہدہ تو سودی قرضوں کا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ علی الاعلان یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم سود ادا کریں گے۔ یہ صورتحال بہت ہی پریشان کن ہے کیونکہ دینِ اسلام میں کفر سے مفاہمت اور مداہنت کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن حکیم اور سیرت طیبہؐ کے مطالعہ سے تو یہی حقیقت سامنے آتی ہے۔ چنانچہ مکی دور کے شروع ہی میں حضور ﷺ سے کہہ دیا گیا

> "اے محمد ﷺ! اپنے جھٹلانے والوں کی باتیں مت مانئے' وہ تو چاہتے ہیں کہ آپؐ مداہنت گوارہ کریں' تو وہ بھی (آپؐ کے ساتھ) مداہنت اختیار کر لیں گے"۔ (سورۃ القلم)

اسی طرح کفار نے جب کہا کہ اے محمدؐ یہ قرآن تو صرف اپنی ہی بات کہتا ہے' کسی اور کی بات ماننے کو قطعاً تیار نہیں ہے' لہٰذا اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن پیش کریں یا اسے تبدیل کریں تو ہم مان لیں گے۔ اس پر سورۂ یونس میں آپؐ سے کہلوایا گیا۔ "کہہ دیجئے اے نبیؐ! میرے لئے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اس وحی میں اپنے جی سے تبدیلی کر دوں میں تو خود اس کا پابند ہوں اور اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو خود مجھے بھی ایک بہت بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے"۔ (آیت:۱۵)

یہ بات قرآن حکیم میں دوسرے مقامات پر بھی بیان ہوئی ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا:

> "اے محمد ﷺ! آپؐ کے دشمن تلے ہوئے ہیں کہ آپؐ کو منحرف کر دیں اس سے جو آپؐ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ آپؐ خود کوئی چیز گھڑ کر ہماری طرف منسوب کر دیں اس پر وہ آپؐ کو دوست بنا لیں گے۔ اور اے نبیؐ! اگر ہم ہی نے آپؐ کو جمائے نہ رکھا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ آپؐ کچھ نہ کچھ ان کی طرف جھک ہی جاتے۔ اس صورت میں (معاذ اللہ!) ہم آپ کو چکھاتے دوگنا مزا زندگی کا اور دوگنا موت کا۔ پھر آپؐ نہ پاتے اپنے لئے ہمارے خلاف کوئی مددگار"۔ (آیت ۷۳تا۷۵)

سیرت طیبہؐ کے مطالعے سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپؐ نے کسی موقع پر نظام کفر سے مفاہمت اختیار نہیں کی۔ چنانچہ ان دینی رہنماؤں کو حق بات کہنے سے نہیں ڈرنا

چاہئے خواہ وہ اسلام قائم کرسکیں یا نہ کرسکیں' کیونکہ وہ اس کے پابند نہیں ہیں بلکہ صرف کوشش کرنا ان کے ذمہ ہے۔ لیکن اگر مجلس عمل کے رہنماؤں نے اسلام کو مغرب کے لئے قابلِ قبول بنانے کی غرض سے اللہ اور رسولؐ کے احکامات کی کتر بیونت شروع کردی تو ان کا اقتدار میں آنا بڑا گھاٹے کا سودا ہوگا۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ کفار ان سے کسی صورت راضی نہ ہوں گے۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ کفر سے متعلق فتویٰ دے دیا ہے:

"اے محمد ﷺ یہ یہودی اور نصرانی آپؐ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپؐ ان کی ملت کے تابع نہ ہو جائیں۔ آپؐ فرما دیجئے کہ اصل ہدایت تو بس اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ اور اگر آپؐ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی اس کے بعد کہ آپؐ کے پاس اصل علم آ گیا ہے تو آپؐ کے لئے اللہ سے بچانے والا نہ کوئی حمایتی ہوگا نہ مددگار۔" (آیت:۱۲۰)

یعنی امریکہ اور مغرب ہم سے کسی طور راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ ہم بالکلیہ ان کے پیروکار نہ بن جائیں' بلکہ اس معذرت خواہانہ انداز سے تو یہ قائدین اپنے آپ کو ہلکا کرلیں گے۔ آج اگر ان انتخابات میں انہیں کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے تو اس کے بعد بھی انتخابات آنے ہیں۔ اس وقت عوام کہیں گے کہ آپ جلسوں میں نفاذِ اسلام کی باتیں کرتے تھے جبکہ عمل اس کے برعکس تھا۔ اس اعتبار سے مجلس عمل کی قیادت اللہ اور عوام دونوں کے سامنے جواب دہ ہے۔ اصل میں اسلام کا کام کرنے والوں کو معذرت خواہانہ انداز کے بجائے اسلام پر ڈٹ جانا چاہئے اور صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ اللہ اور رسولؐ کا کیا حکم ہے۔ یہ نہ دیکھا جائے کہ دنیا کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند؟

بایں حالات متحدہ مجلس عمل کو مرکز میں حکومت سازی کا خیال دل سے نکال کر صوبہ سرحد میں تشکیلِ حکومت کے بعد اولاً معاشرتی سطح پر اسلامی احکامات کی تنفیذ کو یقینی بنانا چاہئے۔ اسلام کا ایک حصہ تو وہ ہے جس کا تعلق فرد سے ہے لیکن اسلام کا ایک اجتماعی نظام بھی ہے' جس کی تین منزلیں ہیں (i) معاشرتی نظام (ii) معاشی نظام (iii) سیاسی نظام۔ ان میں سب سے پہلی اور بنیادی منزل معاشرتی اور عائلی نظام کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں سب سے تفصیلی احکام اسی کے ضمن میں دیئے گئے ہیں۔ اس لئے کہ پہلی منزل اور بنیاد اگر مضبوط ہوگی تو اس پر معاشرتی اور سیاسی نظام کی باقی دو منزلوں کی تعمیر بھی درست طور پر ہو سکے گی!

اسلام کے معاشرتی نظام میں عورت کے حجاب اور عورتوں کے مردوں کے درمیان عدم اختلاط کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "میں نے اپنی اُمت پر عورت سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔" قاضی حسین احمد صاحب نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ ہم عورتوں کے لئے بھی مساوی سطح پر ملازمتوں کا بندوبست کریں گے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو مغرب کے تصورات سے ہم آہنگ ہیں۔ اس ضمن میں ہونا یہ چاہئے کہ اولاً عورتوں کے لئے گھریلو صنعتوں کا بندوبست کیا جائے' اس کے علاوہ ایسے علیحدہ انڈسٹریل یونٹ بنائے جاسکتے ہیں جہاں عورتیں کام کریں اور عورتیں ہی سپروائز کریں' ایسے الگ ہسپتال بنا دیں جہاں ڈاکٹر' نرس اور مریض سب عورتیں ہی ہوں۔ مردانہ ہسپتالوں میں خواتین نرسوں کی موجودگی ہزار فتنوں کو جنم دیتی ہے۔ اسی طرح ہوائی سفر میں میزبانی کی ذمہ داری خواتین ہی کی کیوں ہو؟ کیا کھانے اور ناشتے کی ٹرے مرد اسٹیورڈ نہیں رکھ سکتے۔ معاشی میدان میں تعلیم یافتہ خواتین کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کی ایک صورت یہ ہے کہ لڑکیوں کے اسکولوں اور کالجوں کے ساتھ پوری پرائمری تعلیم ان کے حوالے کردی جائے۔ اس سطح تک کوئی مرد اساتذہ رکھے ہی نہ جائیں۔ یہ اقدامات اسلامی معاشرتی اقدار سے ہم آہنگ ہیں کیونکہ اسلام میں عورت اور مرد کا دائرہ کار علیحدہ علیحدہ ہے۔ چنانچہ مجلس عمل کو صوبہ سرحد میں مرد وزن کے الگ الگ دائرہ کار کے تعین کے ساتھ ساتھ ستر و حجاب اور خاندانی نظام کے حوالے سے اسلامی تعلیمات کو فروغ دینا چاہئے۔

میں اپنے اس قدیم موقف پر آج بھی قائم ہوں کہ اصل' کامل اور محمدیؐ اسلام انتخابات کے ذریعے نہیں آسکتا۔ اس کے لئے انقلاب لازمی ہے اور یہ انقلاب بھی منہجِ انقلابِ نبویؐ کے طریقے پر لایا جانا ضروری ہے۔ اس موقف کی تائید موجودہ صورتِ حال سے بھی ہوتی ہے کہ متحدہ مجلس عمل کامیابی حاصل کرنے کے باوجود اسلام کی طرف کوئی نتیجہ خیز پیش رفت کرتی نظر نہیں آتی۔ لیکن کم از کم یہ تو نہیں ہونا چاہئے کہ اسلام کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے بلکہ ہمیں اسلام کے موقف پر ڈٹ جانا چاہئے تاکہ حق اور باطل آپس میں گڈمڈ نہ ہوں۔ بمطابق فرمانِ خداوندی: "حق کو باطل کا لبادہ مت اڑھاؤ۔ اور نہ ہی جانتے بوجھتے حق کو چھپاؤ!" (البقرہ:۴۲)

کراچی میں تراویح کے ساتھ ترجمۂ قرآن کے مقامات

	علاقہ	مقام	مدرس	پروگرام
-1	ڈیفنس	قرآن اکیڈمی' خیابانِ راحت' درخشاں' فیز 6	جناب عامر خان	تراویح کے ساتھ
-2	یاسین آباد	قرآن اکیڈمی' بلاک نمبر 9 فیڈرل بی ایریا	جناب شجاع الدین شیخ	تراویح کے ساتھ
-3	سوسائٹی	گلستانِ انیس کلب' نزد دہلی پارک چورنگی' مین شہید ملت روڈ	جناب انجینئر نوید احمد	تراویح کے ساتھ
-4	گلشن اقبال	پی آئی اے گارڈن' متصل Planitarium' سوک سینٹر	جناب اعجاز لطیف	تراویح کے ساتھ
-5	نارتھ ناظم آباد	نوبل پوائنٹ شادی ہال' نزد یحییٰ حسن چورنگی	جناب فریس احمد مسعود	تراویح کے ساتھ
-6	رنچھوڑ لائن	الحاج محمد ہاشم گزدر ہال' گزدر آباد' ڈھوتی مارکیٹ (نزد جوبلی)	جناب مفتی طاہر عبداللہ	تراویح کے ساتھ
-7	کورنگی	قرآن مرکز' نزد جامع مسجد طیبہ' سیکٹر 35-A' کورنگی نمبر 4	جناب انجینئر افتخار عالم	تراویح کے بعد
-8	کلفٹن	مسجد نبوی ہاؤسنگ اسکیم' عقب مڈایسٹ ہسپتال'	جناب ذین العابدین جواد	تراویح کے بعد
-9	لانڈھی	مکان نمبر 30/2' ایریا D-1' نزد سنہری مسجد' لانڈھی نمبر 1	جناب انجینئر نعمان اختر	تراویح کے بعد

تجزیہ

متحدہ مجلس عمل کا مثبت رویہ؟

تجزیہ نگار کے نقطۂ نظر سے ادارہ کا کامل اتفاق ضروری نہیں

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اسلام اس مملکت کا باپ ہے اور جمہوریت اس کی ماں ہے تو غلط نہ ہوگا اس لئے کہ دنیا کے نقشہ پر ایک الگ مملکت کی حیثیت سے اُبھرنے کا جواز اسلام ہے اور 1946ء کے انتخابات کے نتائج اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ جمہورت کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ ان انتخابات میں مسلمانانِ ہند نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ اُن کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ پچپن سال میں حقیقی اسلامی نظام کے حوالے سے ہم رتی بھر کوئی پیش رفت نہ کر سکے اور ہماری جمہوریت کبھی انتقالِ اقتدار کی گتھیاں نہ سلجھا سکنے کی وجہ سے دم توڑ گئی اور کبھی ہماری سیاسی جماعتوں نے گنوار اور جاہل عورتوں کی طرح لڑلڑ کر اُسے خاکی بیوروکریسی کے قدموں میں ڈال دیا اِس خاکی بیوروکریسی نے رائج الوقت جمہوریت کو تو بھاری بوٹوں تلے بُری طرح کچل دیا لیکن اِس کے مسخ شدہ لاشہ سے کبھی بالواسطہ بلدیاتی جمہوریت کبھی غیر جماعتی جمہوریت اور کبھی حقیقی جمہوریت کے نت نئے ماڈل تیار کئے لیکن پاکستان دنیا سے کبھی یہ تسلیم نہ کرا سکا کہ وہ ایک جمہوری ملک ہے۔ آج کل پھر ہم انتقال اقتدار کے پل صراط سے گزر رہے ہیں کوئی فرد کوئی جماعت کوئی ادارہ دکھائی نہیں دیتا جو پاکستان کے حوالہ سے سوچے جو اسمبلیوں تک پہنچے ہیں وہ ہرصورت میں اقتدار چاہتے ہیں چاہے ان کی پارلیمنٹ میں نشستیں زیادہ ہیں یا کم جو ادارہ فی الوقت اقتدار پر قابض ہے وہ انتقالِ اقتدار میں سے بہت کم منتقل کرنا چاہتا ہے اور جو کچھ منتقل کرنا مجبوری ہے اُسے بھی صرف اپنے لاڈلوں کو منتقل کرنا چاہتا ہے لہٰذا ترامیم در ترامیم دھڑا دھڑ آ رہی ہیں اور پتہ نہیں چلتا کہ آرڈنس پہلے آیا تھا یا اُس میں ہونے والی ترامیم۔ قصہ کوتاہ جمہوریت جو نازک حالت میں چوتھی بار آپریشن تھیٹر پہنچی تھی اب باہر آیا چاہتی ہے لیکن مقتدر قوتیں بائی پاس کو ناگزیر بلکہ مقدر سمجھتی ہیں۔ سب سے افسوس ناک رویہ مجلس عمل کا ہے جس کی کمٹمنٹ اقتدار سے نہیں اسلام سے نظر آنی چاہئے تھی لیکن وہ اقتدار کی خاطر اسلام سے اپنے تعلق کو دنیا کے سامنے معذرت خواہانہ انداز میں پیش کر رہے ہیں مخلوط تعلیم اگر مسئلہ نہیں ہے سود کی بنیاد پر طے پانے والے عالمی معاہدوں کی اگر پابندی کی جانی ہے نظام صلوٰۃ اور حجاب کے مسئلہ پر اگر سٹینڈ لینے کی ضرورت نہیں ہے تو پھر مجلس عمل کی اسلامی حکومت اور [illegible]

کی رائے میں مجلس عمل کو اللہ تعالیٰ نے سنہری موقعہ دیا ہے ایک طرف وہ صوبوں میں مثالی اسلامی فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کریں۔ سادگی' قناعت اور عدلِ اجتماعی کی وہ مثالیں جو اسلاف کی تاریخ سے وہ مسجد کے منبر پر لوگوں کو سناتے تھے اب اُس کا عملی نمونہ پیش کریں اور صوبائی حکومت کے دائرہ اختیار میں جو کچھ ہے اُسے اسلامائز کریں اور مرکز میں جہاں وہ تیسری بڑی قوت ہیں اپوزیشن کا رول ادا کر دیں اور پارلیمانی جمہوریت جس میں دنیا بھر میں اپوزیشن کو ہر معاملہ میں حکومت کی مخالفت کرنا ہوتی ہے یہ رنگ اختیار کریں کہ وہ جہاں پر بُری اور غیر مفید بات کی

ابو الحسن

مخالفت کریں گے وہاں حکومت کا جو اچھا کام محسوس کریں گے اُس کی حمایت کریں گے وہ یہ نہیں دیکھیں گے کہ کون کر رہا ہے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ کیا کر رہا ہے۔ وہ غیر اسلامی اقدامات کے سامنے دیوار بن جائیں گے اور حق گوئی کا فریضہ ادا کریں گے چاہے کسی پر ضرب آئے البتہ مجلس عمل کو چاہیے کہ ملک کو سیاسی بحران سے نکالنے کے لئے مثبت رویہ اختیار کرے راقم کی رائے میں کیونکہ پاکستان مسلم لیگ (ق) کے پاس سب سے زیادہ نشستیں ہیں پھر یہ کہ حکومت کی پسندیدہ جماعت ہے اُس سے دباؤ ڈلوا کر حکومت سے بعض باتیں منوائی جا سکتی ہیں خصوصاً لیگل فریم ورک آرڈر کے حوالہ سے حکومت اور سیاسی جماعتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی ضرورت ہے۔ مسلم لیگ (ق) حکومت سے مذاکرات کے لئے بہتر پوزیشن میں ہے۔ لہٰذا دوسری سیاسی جماعتوں اور فوجی حکومت کے مابین پل کا کام دے سکتی ہے۔ مجلس عمل مسلم لیگ (ق) پر واضح کر دے کہ انتقال اقتدار کا راستہ ہموار کرنے کے لئے اور کسی متوقع بحران سے بچنے کے لئے وہ یعنی مجلس عمل پاکستان مسلم لیگ (ق) کی حکومت سازی میں مدد تو کر دے گی مگر وہ کسی طرح بھی اور کسی انداز میں حکومت کا حصہ نہیں بنے گی وہ حکومت کے اسمبلی میں لائے ہوئے ہر اس بل کی حمایت کرے گی جو پاکستان کے مفاد میں ہوگا لیکن حکومت کے غلط اور غیر اسلامی کاموں کی کھل کر اور بے دریغ مخالفت کرے گی۔ اس سے "ق" کی حکومت کو بھلائی اور اچھائی کے کاموں کی طرف دھکیلا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں مجلس عمل پاکستان میں اچھی روایت قائم کرنے میں [illegible]

اور مرکز میں ایسی بے مثل اپوزیشن ملک میں اُن کا ووٹ بنک بڑھانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ راقم کی حتمی رائے تو یہی ہے کہ مجلس عمل ملکی خدمت کا یہ انداز اختیار کرے یہی انداز مستقبل میں ان کی کامیابی کا ذریعہ بن سکتا

ہے اور اسلامی نظام کے قیام کی راہ ہموار ہو سکتی ہے لیکن اگر مجلس عمل کے لئے سرکاری عہدوں سے مکمل اجتناب ممکن نہیں تو اُسے صرف ایک ایسی ذمہ داری قبول کر لینی چاہئے جس کا تعلق حکومتی انتظامی معاملات سے نہیں ہے بلکہ صرف قانون سازی سے ہے یعنی قومی اسمبلی کی سپیکر شپ کی ذمہ داری سنبھال لینی چاہئے مگر کوئی وزارت قطعی طور پر حاصل نہیں کرنی چاہئے۔ سپیکر کا عہدہ حاصل کرنے کا فائدہ یہ ہوگا کہ حکومت کو ووٹ کا سہارا دینے کے ساتھ ساتھ حکومت کو صراطِ مستقیم پر رکھنے کے لئے اُس کی طنابیں بھی مجلس عمل کے ہاتھوں میں آ جائے گی وہ اپوزیشن کی کوئی تحریک بلڈوز نہیں کر سکے گی وہ اپوزیشن کے مائیک بند نہیں کر سکے گی جو اکثر حکومتیں اپنے سپیکر کے ذریعے بند کروا دیتی ہیں وہ باتیں منوائی جا سکتی ہیں خصوصاً لیگل فریم ورک آرڈر کے حوالہ سے حکومت کو مجبور کر سکے گی کہ اپوزیشن کو بھی الیکٹرونک میڈیا پر مناسب وقت دیا جائے اُس کا نکتہ نظر بھی عوام کے سامنے آتا رہے تاکہ توازن برقرار رہ سکے۔ وہ اسمبلی میں غلط اطلاعات مہیا کرنے والے یا اعداد و شمار مہیا کرنے والے وزراء کی خبر لے سکی گی اور مسلم لیگ "ق" کی حکومت کو پھونک پھونک کر قدم اٹھانا پڑے گا۔ پہلے کی طرح لوٹ کھسوٹ تقریباً ناممکن ہو جائے گی یہ واحد راستہ ہے جس سے مجلس عمل مثبت رول ادا کر سکے گی۔ لیکن اگر مجلس عمل بھی دوسرے دنیا دار سیاست دانوں کی طرح لیلیٰ اقتدار کی دیوانی ہو کر ہائے ہائے اقتدار کی رٹ لگاتی رہی اور سیکولر جماعتوں کے ووٹوں کے طفیل مرکز میں اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تو یہ صرف اِن اسلامی جماعتوں یا شخصیتوں کے لئے تباہ کن ثابت نہیں ہوگا بلکہ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام مستقبل میں بھی ممکن نہیں رہے گا۔ سیکولر جماعتیں جو کچھ اپنی حکومت میں نہیں کر سکیں وہ سب کچھ مجلس عمل سے حکومت کے لالچ میں کروانے میں کامیاب ہو جائیں گی اور یہ پاکستان اور ملتِ اسلامیہ کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا۔

آرٹ آف پروپیگنڈا

آج عالمِ اسلام کو یہود و ہنود و نصاریٰ نے جس طرح نرغے میں لے رکھا ہے اس کی مثال تاریخ میں شاید ڈھونڈے سے نہ مل سکے۔ دنیا بھر کے غیر مسلم ممالک یوں تو اٹھتے بیٹھتے سیکولرزم کی مالا جپتے رہتے ہیں لیکن عالمِ اسلام کے مقابل اپنے اپنے عقیدے میں انتہائی کٹر بن جاتے ہیں۔ اسوقت جبکہ عراق میں آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم کی طرز پر شوڈاؤن ہوا ہی چاہتا ہے ''امریکی میڈیا مشین'' اسلام مخالف پروپیگنڈے میں زور و شور سے مصروف ہے۔ اسامہ بن لادن اور صدام حسین کی مثال تو اب کچھ یوں ہو چکی ہے کہ دفتر میں ایک ملازم کو طلب کر کے افسر نے کہا کہ آج سے تمہاری ذمہ داریاں بڑھا دی گئی ہیں۔ ملازم اسے ترقی کا پروانہ سمجھ کر خوش ہوا تھا کہ افسر کی آواز سنائی دی، آج سے ہر غلطی کے ذمہ دار تم ٹھہرو گے۔ اگر صدام حسین پر ایٹمی، کیمیائی، نباتاتی، حیاتیاتی غرض ہر طرح کے ہتھیاروں کے الزام لگائے جاتے ہیں اور مغرب میں پتہ بھی کھڑک جائے تو اسامہ پر برق گرتی ہے۔ پورے افغانستان کو تورا بورا بنانے سے پہلے بن لادن کو ''امریکی میڈیا مشین'' نے دنیا بھر میں dark star of islam کے طور پر تعارف کرایا۔ گارجین اپنی اسپیشل رپورٹس میں طالبان کو ''قابلِ نفرت گروہ'' لکھتا رہا ہے۔ ''امریکی یہودی میڈیا مشین'' نے ایک عرصے سے اسلام اور مسلمانوں کو مغرب کے لئے خطرناک عنصر بنا کر پیش کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے اور یوں کامیاب و کامران یو۔ ایس ایڈمنسٹریشن اپنے ''دشمن'' کی طرف پوری دنیا کو متوجہ کرنے میں مزید کامیاب ہوئی ہے۔ گلف وار ۱۹۹۱ء میں امریکہ نے ورلڈ وار دوئم کے بعد اپنے انٹرنیشنل حمایتیوں کی بڑی تعداد میں تائید حاصل کی۔ جس کی سب سے اہم وجہ ایران عراق جنگ کے دوران میڈیا کا صدام حسین کے لیئے منفی پورٹریٹ پیش کرنا تھا۔ لہذا امریکہ کے انٹرنیشنل الائنس نے اپنی توانائیاں امریکی حمایت میں صرف کر دی تھیں۔ یو۔ ایس۔ اے اپنے دشمنوں کے نام لکھ لکھ کر ان پر ''آپریشن'' کی مہر ثبت کرتا ہے۔ جبکہ میڈیا پری آپریشن کے بطور ان دشمنوں کا نام پوری دنیا میں ڈلیور کر دیتا ہے تاکہ دنیا بھر کی ذہن سازی کی جا سکے۔ فی الوقت ''امریکی میڈیا مشین'' صرف ایک نام کو مغرب کے لئے کھلا خطرہ قرار دے رہا ہے اور وہ ہے Islam and Islamic Fundamentalist Groups. اس سلسلے میں میڈیا کی رات دن کی کوشش دنیا کو یہ باور کروانا ہے کہ اسلام اور دہشت گردی کا مطلب ایک ہی ہے۔ نتیجتاً آج مغربی ممالک میں مسلمانوں اور عربوں کو دہشت کی علامت سمجھا جا رہا ہے۔ میڈیا کے افراد کو باقاعدہ پروپیگنڈا کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ پروپیگنڈا کے نام سے آرگنائزیشن موجود ہے جو منفی پروپیگنڈا کرنے یعنی جس ادارے، شخص یا تحریک کو نقصان پہنچانا مقصود ہو اسکے خلاف آئیڈیاز، معلومات اور افواہیں پھیلانے کے گُر سکھائے جاتے ہیں اور اسکے سبب پیدا ہونے والا منفی پبلک ایکشن زبردست کامیابی گردانا جاتا ہے۔ میڈیا ایڈوائزری نیٹ ورکس کو

رعنا ہاشم خان

گورنمنٹ کی زیرِ نگرانی کام کرنا ہوتا ہے۔ چند ماہ پیشتر امریکی ٹیلی ویژن نیٹ ورک کے ایگزیکٹوز نے نیشنل سیکیورٹی ایڈوائزر کے ساتھ ایک کانفرنس کا انعقاد کر کے ان سے یہ درخواست کی تھی کی براڈ کاسٹ میں سے اسامہ اور القاعدہ کے خلاف ایسے الفاظ کا استعمال ترک کر دینا چاہئے جو فساد کی آگ بھڑکانے کا باعث بن سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ نہ تو وائٹ ہاؤس اسامہ اور القاعدہ کو سیدھے سادھے الفاظ میں پیش کرنے کا خطرہ مول لے سکتا ہے اور نہ براڈ کاسٹ کو اسلام کے خلاف پُر اثر بنائے بغیر آن ایئر جاتا دیکھ سکتا ہے کہ دونوں صورتوں میں اسلام مخالف امریکن آرٹ آف پروپیگنڈا متاثر ہوگا۔ لہٰذا اس درخواست کے جواب میں یہی کہا گیا کہ بے شک پوری خبر یا وڈیو نشر کی جائے لیکن القاعدہ اور اسامہ کو مسلسل یو۔ ایس براڈ کاسٹ میں شامل رکھا جائے۔ اسی طرح ٹائم میگزین بھی وقتاً فوقتاً اسلام کے خلاف زہریلے پروپیگنڈے کو اپنا حق گردانتا ہے۔ اکثر و بیشتر اس تمام دنیا میں مشہور میگزین کا اسلام مخالف سرِ ورق اور شہ سرخیاں باشعور قارئین کو اس میگزین کے اسلام مخالف متعصبانہ جذبات کی تہہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے ''دہشت گرد'' کی اصطلاح یہ میگزین ۹۰ کی دہائی سے استعمال کر رہا ہے۔ شاتمِ رسول ﷺ ملعون سلمان رشدی کو اس میگزین نے ''ہیرو آف دا ویسٹ'' قرار دیا۔ اسی طرح اس میگزین کے صفحات پر رشید دوستم کو بارہا دیگر افغان لیڈرز پر فوقیت دی گئی۔ مغرب کے اس اسلام مخالف پروپیگنڈے کی یوں تو کئی وجوہات ہیں لیکن بظاہر جو نظر آتی ہیں وہ یہی ہیں کہ

۱) اس طرح مغرب نے اپنے عوام کی توجہ حقیقی ایشوز سے ہٹانے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے۔

۲) اسلام سے خوفزدہ ابلیسی قوتیں اسلام کے خلاف زہر اگل کر اپنی فرسٹریشن کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

۳) سیکولرسٹ آئیڈیالوجی نے قریباً قریباً عیسائیت کا بھرکس نکال دیا ہے لیکن ایک بلین سے زائد مسلمانوں کو ہلا بھی نہیں سکی ہے۔ نتیجتاً عیسائی دنیا کی یہ ناکامی عالمِ اسلام کے خلاف نفرت کا لاوا بن کر پھوٹ نکلی ہے۔

۴) سیکولرزم میں موجود اخلاق باختگی، ناانصافی اور کسی بھی قسم کی خوبی نہ ہونے کے باعث لوگوں کی توجہ اسلام کی طرف مبذول ہوئی اور لوگ مسلسل اسلام قبول کر رہے ہیں جس کی ایک مثال ۱۱ ستمبر کے بعد ۳۵ ہزار افراد کا قبولِ اسلام ہے اور اسلام سے متعلق تصانیف کی گزشتہ ایک برس میں امریکی مارکیٹ میں ریکارڈ توڑ بزنس ہے۔

لہٰذا نفرت کی توپیں پروپیگنڈے کی شکل میں بڑھ چڑھ کر گرج رہی ہیں۔ عالمِ اسلام کو زک پہنچانے کی سازش کا حاصل یہ ہے کہ یہود کو محفوظ کر دیا جائے اور عالمِ اسلام کے ایٹمی و مادی وسائل پر تسلط حاصل کر لیا جائے۔ اس صورتحال میں عالمِ اسلام پر واجب ہے کہ نہ صرف دینِ حق کی صداقت مغرب پر آشکار کرتا رہے بلکہ اپنی آرزوئیں، امیدیں اور خواہشیں ہرگز ان سے وابستہ نہ کرے۔

ضرورت رشتہ

☆ دو بہنیں، تعلیم بی اے، عمر 24 اور 22 سال کے لئے تعلیم یافتہ دینی گھرانوں سے رشتہ درکار ہے۔

رابطہ فون : 042-7215034

☆ بیوہ، عمر 22 سال، ایک بچی عمر 2 سال، صوم و صلوٰۃ کی پابند کے لئے دینی گھرانے سے رشتہ درکار ہے، ذات پات کی کوئی قید نہیں۔

رابطہ : قرۃ العین خان، فون: 042-6305393

ستارے کا پیغام

مجھے ڈرا نہیں سکتی فضا کی تاریکی
مری سرشت میں ہے پاکی و درخشانی
تُو اے مسافرِ شب خود چراغ بن اپنا
کر اپنی رات کو داغِ جگر سے نورانی

What else does the US need other than Maulana Fazlur Rehman or Qazi Hussain Ahmad in the Prime Minister House and a few articles outlining such points. Besides MMA's victory, other factors are also well in place for a justified attack on Pakistan under the new US doctrine. On the basis of American rationale, Pakistan fulfils the criteria of a legitimate target for a pre-emptive strike. When it comes to weapons of mass destruction, our unregulated, un-inspected nuclear bombs and delivery systems put us way ahead of Iraq.

Elements of our intelligence and military services had well-established links with the now untouchable Taliban. Leading Al Qaida figures, and possibly Osama bin Laden, are supposedly holed up in our backyard. Pakistan is as much a "safe heaven" for terrorists as was Afghanistan. The US has already accepted Indian allegations that Pakistan is the prime, deliberate exporter of terrorism in other directions. And above all, a military dictator is still running the show and has all the strings in his hand.

We won't have enough Muslims brothers to sacrifice or hand over as "suspects" to the US as down payment to keep it at arms length. We cannot remain in Mr. Bush's febrile camp because public opinion is swinging against our role in the so evident US-led war on Islam. How certain can we be that a US administration obsessed with dominating Muslim countries in particular, successfully occupying Afghanistan and possibly emboldened by Iraqi invasion, and apparently pricked by the planned rise to power of religious parties in Pakistan will not eventually turn on us?

The MMA is between the devil and the deep sea. It should not fritter away this opportunity by losing their focus on Islam. During the last year or so of their rule, the Taliban too did their best to please the US. The western propaganda, however, was so powerful that none of their attempts to please the world within the boundaries of Islam could make a significant difference. Statements by the MMA leadership, such as "it would not be a government of maulavies," or "we are not extremist or fundamentalist parties" would hurt their image and ideology. It should adopt an accommodating attitude and should be ready to make compromises to make democracy work but not at the cost of the basic principles of Islam. A rigid attitude in governance and politics would not hurt their cause as much as their appeasement on core issue only for the sake of staying in alliance with secular parties.

It is up to the leadership of MMA to decide the framework in which it wishes to operate, politically as well as administratively. They have promised for bringing the system of "ALLAH" and through whatever means it may be, they have got an opportunity. Like any other party they have constitutional and moral right and responsibility to implement their agenda. Since it does not have much time and space for complete reformation, it should focus on what it can effective achieve - such as steps towards simple governance, propagation of religion, education of Qur'an and Islamiyat, and working as a pressure group for influencing major policy decisions.

And, above all, the MMA should remain cautious of the danger that it would be used as another scapegoat like the Taliban for undermining Islam.

Reference:

(1) Mir Jamilur Rahman, "Who is afraid of MMA?" The News, Saturday October 19, 2002

انجمن خدام القرآن سندھ' کراچی کے زیر اہتمام

ایک سالہ قرآن فہمی کورس

☆آغاز: 30 / دسمبر 2002ء ☆اوقات: صبح 9:00 تا 1:00 بجے دوپہر

☆بمقام: قرآن اکیڈمی ڈیفنس' کراچی ☆قابلیت: کم از کم F.Sc/F.A و مساوی

☆نصاب: آسان عربی گرامر' منتخب نصاب قرآنی' تجوید' منتخب احادیث'

مسائلِ طہارت و نماز' دینی و تحریکی لٹریچر' اقبالیات

☆ذہین اور مستحق طلباء کے لئے خصوصی رعایت

☆داخلے کی آخری تاریخ 27 دسمبر 2002ء ہے۔

نوٹ: بیرونِ کراچی خصوصاً اندرونِ سندھ کے حضرات کے لئے رہائش و طعام کی سہولت کا خصوصی انتظام ہے۔

خواتین کے لئے خواتین معلمات کے زیرِ اہتمام اس سال علیحدہ کورس کا انعقاد کیا جا رہا ہے

قرآن اکیڈمی' خیابانِ راحت' درخشاں' فیز VI' ڈیفنس' کراچی فون: 5340022

فیکس: 5840009 ای میل: karachi@quranacademy.com

Vol:11 Regd.CPL No.127 No.44

Weekly Nida-e-Khilafat Lahore

View Point

Abid Ullah Jan
(E-mail: abidjan@tanzeem.org)

MMA: Between the Devil & the Deep Sea

Will MMA translate its political slogans into policies if it forms a government? Everyone is seriously examining this question without knowing that Washington and Islamabad already know the simple answer. If it does, it may face a fate worse than Rifah, FIS or even the Taliban. If it does not, it will never taste an electoral victory in the foreseeable future. In both cases, the stage is well set for restarting the process of demonising Islam - a process that almost stopped for lack of direct reference with disappearance of the Taliban and arrival of American occupation forces on the scene in Afghanistan.

There are several theories about why the MMA's victory has happened. But more important is to ask: How this has happened? There is the belief that the MMA was clobbered together by the military government when it saw that its own PML(Q) was not making the desired headway against the PPP and the PML(N). That might be true but what we are ignoring is the real motive of the hidden forces that play a role in bringing religious parties to the forefront. The motive could well be looking for opportunities to show the world another "dirty" face of Islam.

Undoubtedly, there was a tendency on the part of the ultra-moderate elements to take the religious sentiments of the majority for granted. They were unable to correctly read the depth of feeling of the people with regard to Pakistan's cooperation in the US "war on terrorism." There is also no reason to doubt that anti-US and anti-Musharraf feelings too were at play in varying degrees. But perhaps the most important factor to note is that neither the Taliban could become the Taliban without an outside support, nor could the MMA secure such an unprecedented victory without the involvement of a foreign hand.

There is always too much behind all that glitters. We have every reason to doubt credibility of the so-called religious leaders who have ignored their principles for the sake of fame, dollars or power. A glaring example is Maulana Sami-ul-Haq's publishing fake pictures of the arrest of his son during anti-US demonstration in September 2001. According to eyewitnesses, his son was at home the day his pictures were published in the newspapers showing him in police custody. This shows collusion with police and the government, and a betrayal of the public trust. We have thus every right not to give the MMA full credit for its victory.

Of course, it was a misconception of the "enlightened" westernised segments in Islamabad, Lahore and Karachi to say that the Islamisation of Gen Zia or Shari'a rule of the Taliban had driven people away from religion. Admittedly, most people noticed that mosque congregations are swelling even in cities like Islamabad and Karachi, and that more women, even without being forced to, are taking to the veil. People were definitely on the MMA's side. However, we cannot rule out possibility of a stage-managed sleight of hand to pave the way for an out right ban on religious parties in the near future. We must not fail to remember the fact that the Taliban could not have been removed without first demonising them for years for what they had not actually done.

The anti-Islam show has already begun. Pakistani press has already taken an initiative. Leading English dailies have started pouring in anti-MMA articles with an unprecedented frequency. Pick up the News and only on October 19, it carried three out of four articles on the spectre surrounding the MMA's victory. Just as Musharraf took full advantage of anti-US demonstrations in September 2001, the moderate-mafia is set to reap full rewards of having MMA as a scapegoat for telling the world: "look this is what they call Islam."

In a sugar coated article, Mir Jamilur Rehman, lists what MMA would do and what "terrify the whole world." He believes many are frightened "for good reasons" such as the fear that MMA would: 1. make hijab compulsory; 2. consider sleeveless shirts, jeans and dopatta-less head as vulgar; 3. abolish co-education and "may also" discourage the use of inter net; 4. establish an "unnecessary" separate commuting system for women; 5. not allow American bases in Pakistan; and 6. chop hands of thieves, or stone adulterous person, or carry out punishment prescribed under blasphemy law.[1]

Does not the Qur'an instruct for hijab? It is not MMA that considers dopatta-less women in sleeveless shirts and tight jeans as vulgar. We may refer to Qur'an to see who considers such practices as vulgar. Shall we abandon Qur'an so as not to offend the world? The language that the MMA "may" do this or that, actually pre-judges it. It amounts to putting words in the MMA's leadership mouth even before its appearance on the stage.